جلد ۷۱ — جنوری ۱۹۶۹ء — عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرِ سالانہ سات روپے — فی پرچہ ۷۰ پیسے

جہاد اسلامی

اسلام کے نظام جنگ پر

ایک منفرد کتاب

مؤلفہ خلیل احمد حامدی

مضامین ایک نظر میں

- مقاصد جہاد۔
- فضائل جہاد۔
- اقسام جہاد۔
- خواتین کا جہاد۔
- مراتب شہادت۔
- جہاد کی تیاری۔
- افواج اسلامی کے اجزاء۔
- اسلام کا نظام جنگ۔
- احکام جنگ۔
- صلوۃ خوف۔

ملت اسلامیہ کے
ہر فرد خصوصاً
افواج اسلامی
کیلیے
ایک رہنما کتاب

اعلیٰ ایڈیشن۔ ۵ روپئے۔ سستا ایڈیشن ۲/۷۵ روپئے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ لاہور۔ فون ٦٨٣٤١

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۰	جنوری ۱۹۶۹ء مطابق شوال ۱۳۸۸ھ	عدد ۵

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن کے گزشتہ شمارے میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ اضطراب کی جس لہر نے اس وقت پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے وہ کسی وقتی اور ہنگامی سبب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے بعض گہرے اسباب ہیں جنہوں نے ہماری اجتماعی زندگی کے دھارے میں غیر معمولی ہلچل پیدا کر دی ہے۔ اسی ضمن میں ہم نے چند اسباب کی نشاندہی بھی کی تھی۔ اِن صفحات میں ہم بعض ایسی تدابیر کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک ہماری زندگی کی جوئے رواں میں نہ صرف سکون اور اعتدال پیدا کر سکتی ہیں بلکہ ہماری کشتِ ویراں کو جلد از جلد سرسبز و شاداب کر کے اُمتِ مُسلمہ اور پُوری انسانیت کے لیے طمانیت بھی فراہم کر سکتی ہیں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ۔

اصلاحِ حال کی کوشش کے سلسلے میں حکمراں طبقہ کو یہ بات پُوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر وہ محض قوت کے بل بوتے پر اور پولیس کے ناروا تشدّد اور نوکرشاہی کے جبر و استبداد سے حالات میں اعتدال پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے جسے وہ جتنی جلدی اپنے ذہن سے نکال دے اُتنا ہی ملک اور قوم کے لیے اور خود اُس کے لیے مفید ہے۔ تشدّد کے ذریعہ نہ تو آج تک کبھی حق کی آواز دبی ہے اور نہ عوامی احساسات کو کچلا جا سکتا ہے۔ جو حقائق سورج کی طرح عیاں اور سانس کی طرح ہماری زندگی کے قریب اور اُس پر اثر انداز ہونے والے ہوں انہیں آخر عوام تشدّد کے خوف سے کس طرح جھٹلا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ وقتی طور پر خاموش ہو جائیں مگر اُن کے دل و دماغ میں تو یہ حقائق موجود رہیں گے۔ اور خارجی دباؤ کی وجہ سے وہاں طوفان اُٹھاتے رہیں گے، اور دیر یا سویر یہ سیلِ بے پناہ کی صورت اختیار کر کے غلط راستوں پر بہہ نکلیں گے۔ اور اگر ایک مرتبہ یہ

لاوا پھوٹ پڑا تو پھر ہمارے فکر و نظر کا کوئی گوشہ اور ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اس کی زد سے محفوظ نہ رہے گا۔ ماضی کو تو جانے دیجیے اس تشدّد کے ردّ عمل کے لاتعداد رُوح فرسا واقعات انقلاب فرانس اور انقلاب روس میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مظلوم اور پسے ہوئے طبقے غالب گروہوں سے بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ پہلے محض جینے کا حق مانگتے تھے اور اُن کے جذبۂ رحم سے اپیل کرتے ہوئے ان سے بار بار یہ کہتے تھے کہ آخر ہم بھی انسان ہیں، ہمیں بھی جسم و جان کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے بنیادی ضروریات درکار ہیں، ہم بھی انصاف کے مستحق ہیں، ہمیں بھی اپنی عزتِ نفس کا کچھ احساس ہے، خدارا ہمارے ساتھ حیوانوں اور درندوں کا سا سلوک نہ کرو۔ مگر اقتدار کے نشے میں بدست طبقوں نے ان کی آہ و فغاں پر بالکل کان نہ دھرے اور نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک ایسا طوفان اٹھا جس نے پوری زندگی کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔

ملک کے اُفق پر اس وقت جو تاریک گھٹائیں چھا رہی ہیں اور عوام کے دل میں اپنے ماحول کے خلاف حقارت و نفرت کے جو جذبات اُمڈ رہے ہیں، وہ کسی شدید طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے ملک کے اربابِ بست و کشاد اس طوفان سے پہلے سنبھل جائیں اور دیانتداری سے اصلاحِ حال کی کوشش کریں اور اس تباہی سے ملک اور قوم کو بچائے جائیں جو اس قسم کے طوفان کے ساتھ لازمی طور پر آتی ہے۔ یہ طوفان جب اُٹھتے ہیں تو صرف حکومت کرنے والے ہاتھ ہی تبدیل نہیں ہوتے بلکہ ماضی کی ساری اقدار بھی نیست و نابود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ فرانس میں جب یہ طوفان اٹھا تو اس سے جاگیرداری اور پاپائیت کا محل تو بلاشبہ مسمار ہو گیا مگر اس کے ساتھ ہی مذہب اور اُس کی ساری تعلیمات بھی خس و خاشاک کی طرح بہ گئیں اور نہ صرف فرانس بلکہ سارا یورپ الحاد کے اندر غرق ہو گیا۔ اسی طرح جب روس میں اس انقلاب کے شعلے بلند ہوئے تو صرف زارِ روس اور اُس کے حامیوں کا تسلط ہی ختم نہ ہُوا بلکہ انسانیت کے وہ سارے ضابطے اور اصول بھی جنہوں نے انسان کو انسان بنانے میں بہت بڑی خدمت سرانجام دی تھی، راکھ بن کر رہ گئے۔ اور انسانیت کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل ابتدا سے اپنے سفر کا آغاز کرنا پڑا۔ ہمارے ملک کے سارے بہی خواہوں کو ان واقعات سے عبرت پکڑنی چاہیے اور کبھی اس بات کی کوشش نہ کرنی چاہیے کہ چڑ اور ضد میں آ کر کوئی ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جائے جس میں تبدیلی کے جذبات

غلط رُخ پر بہہ نکلیں اور ملت ایک ایسے طوفان کی گرفت میں آجائے جس میں اُس کا سارا اخلاقی اور دینی اثاثہ ہی بالکل برباد ہو کر رہ جائے۔

اصلاحِ احوال کے لیے ہمارے نزدیک سب سے ضروری چیز نصب العین کا نہایت واضح تعین ہے۔ پوری قوم ۲۲ سال سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے اور اُسے ابھی تک طے کر کے یہ بتایا نہیں گیا کہ اس کی حقیقی منزلِ مقصود کیا ہے۔ یوں تو ملک کے سربراہ قوم کو ہمیشہ یہی بشارت دیتے چلے آرہے ہیں کہ وہ اس کے دامن کو اسلام کی نعمت سے بھرنے کا عزم رکھتے ہیں لیکن قوم بیچاری اس نعمتِ عظمیٰ کی کوئی معمولی سے معمولی مقدار بھی پا نہیں سکی بلکہ وہ بیچاری تو انتہائی تشویش کے عالم میں یہ دیکھتی ہے کہ دینِ حق کا جو بچا کھچا سرمایہ اُس کے پاس تھا، وہ اُس سے بھی محروم کی جارہی ہے۔ اسلام کا نام اور اس کے ساتھ برسرِ اقتدار طبقوں کی عقیدت مندی کے اعلانات سُن سُن کر اس کے کان پک چکے ہیں۔ اور وہ اب یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہے کہ اسلام اس گروہ کے نزدیک محض ایک سیاسی چال یا دلفریب نعرہ ہے جس سے وہ اُسے کئی برس سے بیوقوف بنا رہا ہے۔ اس امتِ وسط کو عملی طور پر مغربی افکار کا غلام اور مغربی تہذیب و تمدّن کا نمونہ بنایا جا رہا ہے، مگر وابستگی اسلام سے ظاہر کی جا رہی ہے تاکہ یہ کہیں اپنے آقاؤں کی کوششوں سے برگشتہ نہ ہو جائے۔

اسلام جس طرزِ فکر اور جس طرزِ عمل کو دنیا سے مٹانے آیا ہے اس کی پوری طرح سرپرستی ہو رہی ہے بلکہ اس بات کا پورا پورا التزام کیا جا رہا ہے کہ یہ جلد ہی قوم کے رگ و پے میں پوری طرح سرایت کر جائے اور جو لوگ اس راہ میں مزاحم ہوں انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ لیکن جہاں تک زبانی دعووں کا تعلق ہے، ہر موقع پر یہی کہا جاتا ہے کہ انہیں اسلام ہی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اسلام کے ساتھ اس قسم کے کھلے اور شرمناک مذاق کو آخر عوام کب تک برداشت کر سکتے ہیں۔ اسلام کوئی خوابِ پریشان تو نہیں کہ جس کی ہر اُلٹی سیدھی تعبیر کو لوگ قبول کر لیں۔ اسے باری تعالیٰ نے سورج سے زیادہ روشن دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور پھر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعہ خود اپنی نگرانی میں اس کا مثالی طور پر نفاذ کروا کر اس کی عملی صورت کو بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ کوئی گروہ یا قوم اسے اپنائے یا نہ اپنائے، اس کو اختیار

ہے، لیکن یہ بات کسی طرح ممکن نہیں کہ اس کا نام لے کر لمبے عرصے تک کسی کو دھوکہ دیا جائے۔ کوئی فرد جب اسلام کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے اس امر کی بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ خدا سے ڈرنے والا، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پیروی کرنے والا، کھلے اور چھپے معاملات میں حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہونے والا اور نوعِ بشری کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا برتاؤ کرنے والا ہو۔ بالکل اسی طرح جب کوئی صاحبِ اقتدار یہ کہتا ہے کہ وہ اسلام کا شیدائی ہے اور وہ اس دینِ حق کو ہی انسانی فوز و فلاح کا ضامن سمجھتا ہے تو پھر انسان بالکل فطری طور پر اس بات کا متوقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور اختیار کو اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال کرے گا اور ملک کے جملہ وسائل اُن بھلائیوں کو فروغ دینے کے لیے وقف ہونگے جنہیں اسلام پروان چڑھانا چاہتا ہے اور اُن برائیوں کے استیصال کے لیے صرف ہونگے جنہیں اسلام مٹانے کا متمنی ہے۔ ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ مسلمان اتنا تو بہر حال جانتا ہے کہ اسلام کو اگر دیانت داری سے اپنایا جائے تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج بہر طور پیدا ہوتے ہیں۔

- استبداد کا خاتمہ۔ کیونکہ اسلام عدل و انصاف کا علمبردار ہے۔
- فحاشی اور بدمعاشی کا قلع قمع کیونکہ اسلام انہیں انسانیت کے لیے خطرناک قسم کے روگ سمجھتا ہے۔
- ہر قسم کے ناجائز استحصال کی بیخ کنی، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ چوری اور ڈاکہ زنی سے قبیح جرم ہے۔
- رشوت ستانی، چور بازاری، سٹہ بازی، سود، اکتناز دولت اور ارتکاز دولت کا خاتمہ، کیونکہ یہ معائب اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ انسان، انسانیت کی بنیادی اقدار سے یکسر محروم ہو چکا ہے اور اُس نے دولت کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔
- اسلامی معاشرے کے ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی فراہمی، کیونکہ اسلام نے مملکت پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے۔
- تحریر و تقریر کی آزادی، کیونکہ یہ انسان کا ایسا پیدائشی حق ہے جو اُسے خداوندِ قدوس نے عطا کیا ہے۔
- مملکت کے اندر رہنے والے تمام افراد کے درمیان مساوی سلوک کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے درمیان بجز نیکی اور تقویٰ کے اور کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔ سب انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں اس لیے سب کے

درمیان عدل و مساوات قائم ہونی چاہیے۔

• اللہ اور اُس کے رسول کے عائد کردہ فرائض کی بجا آوری۔

• مسندِ اقتدار سنبھالنے میں عوام کی منشا اور مرضی اور امورِ مملکت چلانے میں خدا اور خلق دونوں کے سامنے مسئولیت۔

اسلام کی اجتماعی زندگی کے یہ وہ چند بنیادی اصول ہیں جو تمام مسلمانوں کے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہیں بلکہ جن کی جڑیں ان کے جذبہ و احساس میں گہری اتری ہوئی ہیں۔ پھر ان اصولوں کی عملی شکل ان کے سامنے ہے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ ہادی برحق حضور سرور دو عالم اور اُن کے رفقاءِ کار (اللہ تعالیٰ اُن سب پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل کرے) نے کس طرح فقیری میں شاہی کا عملی نقشہ پیش کیا، انہوں نے کس طرح غریب اور کمزور کے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کی، انہوں نے معاشرے میں برائیوں کا کس طرح خاتمہ کیا۔ انہوں نے انسان کو اسلامی اخلاق کا پیکر بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں۔ انہوں نے اپنے اختیارات کو کس احساس ذمہ داری اور فرض شناسی کے ساتھ استعمال کیا۔ انہوں نے کس دردمندی کے ساتھ یتیموں، بیکسوں اور بیواؤں کی دستگیری کی۔ انہوں نے عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی محافظت کا فرض کس گہرے خلوص کے ساتھ سرانجام دیا، اور سب سے بڑھ کر اقتدار کے بار کو کس طرح اللہ کی طرف سے ایک مقدس امانت سمجھ کر اٹھایا اور اسے اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے کے بجائے آخرت کی کامرانی کا ذریعہ بنایا۔ ان تصورات کے ذہن میں پوری طرح موجود ہوتے ہوئے کوئی مسلمان آخر یہ کس طرح باور کر سکتا ہے کہ اس ملک کے برسرِ اقتدار طبقے اسلام کے معاملے میں مخلص ہیں اور فی الواقع وہ یہاں اس دین کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں نے شاید یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسلام کے نام پر وہ مدتِ مدید تک مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوںگے مگر یہ محض ابلہ فریبی ہے۔ اسلام کوئی خارزار نہیں بلکہ یہ پھل دینے والا سایہ دار درخت ہے جب کوئی قوم اپنے قلب و دماغ میں ایمان کا بیج بو کر عملِ صالح کے ذریعے اس کی باقاعدہ آبیاری کرتی ہے تو یہ درخت تنومند ہو کر اُس پر امن کا سایہ کرتا ہے اور اُسے ظلم و استبداد کی تپش سے بچاتا ہے۔ پھر

اُس کی جھولی میں ایک صالح نظامِ تمدن، ایک عادلانہ نظامِ سیاست اور معیشت کے پھل ٹپکاتا ہے تاکہ لوگوں کی رُوح کو چین اور جسم کو آرام نصیب ہو۔ مسلم قوم کبھی اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ اسلام کا درخت بار آور نہ ہو۔ مسلمان اس درخت کے حیات آفریں سائے کی وسعت اور اس کی ٹھنڈک کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اُس کے پھلوں کی شیرینی سے بھی پُوری طرح لذت آشنا ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ سخت غلطی پر ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے مغربی تہذیب کے منحوس درخت کے تاریک سائے اور شجرِ اسلام کے طمانیت بخش سائے کے درمیان جو واضح امتیاز ہے اُسے مسلمانوں کے ذہنوں سے مٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مغربی تمدّن کے کڑوے پھل کے متعلق یہ باور کرا سکیں گے کہ یہ اسلام کے ہی ثمرات ہیں۔ مسلمان قوم کو آخر اتنا بیوقوف کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ اتنی سادہ سی حقیقت بھی سمجھنے سے اب قاصر ہے کہ جس دین کو باری تعالیٰ نے خلق کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجا ہے اس میں جور و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس میں انسانوں کی خدائی کا سکہ کبھی نہیں چل سکتا۔ اس میں لوگوں کو ان کے انسانی حقوق سے کبھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ جس خدا نے اس کائنات کو حق اور انصاف کے ساتھ پیدا کیا ہے اور چیونٹی سے کر ہاتھی تک سب کے لیے رزق کا سامان فراہم کیا ہے اس کے نظام کے بارے میں آخر ناانصافی اور وسائلِ رزق سے محرومی کا تصور کس طرح ہو سکتا ہے۔

اس لیے ہم اس ملک کے اربابِ اقتدار اور دوسرے رہنماؤں اور سربراہوں کی خدمت میں یہ بات بڑی دردمندی سے کہنا چاہتے ہیں کہ اس ملت کی فلاح و بقا کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کو بطور سیاسی چال استعمال کرنے کے پرانے مشغلے کو چھوڑ کر اس کے ساتھ سچی وابستگی پیدا کی جائے۔ دینِ حق کے ساتھ عقیدت مندی کے اعلانات سے اب لوگوں کے جی بھر چکے ہیں اور اُن کے لیے مجرد ان خوش کُن بیانات میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ وہ اب اسلام کے نعروں سے اپنا دل بہلانے پر کسی صورت بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ اب وہ اس بات کے آرزومند ہیں کہ اسلام فی الحقیقت آئے اور اُن کی بگڑی بنائے۔ وہ اُن کے قلب و دماغ کو منور کرے، وہ ان کی معاشرت میں پاکیزگی پیدا کرے، وہ اُن کی سیاست کو خدا ترسی کی فضا سے معمور کر دے وہ ان کی معیشت کو ظلم و استبداد سے محفوظ کر کے عدل و انصاف کی بنیاد پر ازسرِ نو استوار کرے۔

دنیا میں اس سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں کہ کسی مقدس شے کی تقدیس کے نام پر لوگوں کو فریب دیے جائیں اللہ کے قانون نے کبھی اس مذموم کاروبار کو دیر تک دنیا میں چلنے نہیں دیا۔ اس نے اس قسم کی فریب کاری کرنے والوں کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کر کے مقدس چیزوں کی تقدیس کی پوری طرح حفاظت کی ہے تاکہ دنیا میں اُن کی عظمت بجوں کی توں قائم رہے۔ البتہ جو لوگ اس قسم کے دھندے کرتے ہیں انہیں دنیا میں ہمیشہ ذلیل اور رسوا کیا ہے۔ رب العزت کی غیرت آخر اس بات کو کس طرح گوارا کر سکتی ہے کہ عیار لوگ اس کے مقدس دین کو بازیچہ اطفال بنائیں اور سچے دل سے اس کی پیروی کرنے کے بجائے اُسے قوت و طاقت حاصل کرنے کے لیے بطور آلہ کار استعمال کریں۔ اس بنا پر ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قوم کی اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو سکتی جب تک ہم اسلام کے بارے میں خلوص نیّت کے ساتھ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر لیتے۔

اگر کسی گروہ کو اسلام واقعی عزیز ہے تو پھر اُسے اس معاملے میں پوری یکسوئی کا ثبوت دینا چاہیے اور اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کر دینا چاہیے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فلاح و کامرانی کا راز صرف اسلام کو اپنانے میں سمجھتا ہے۔ اور اگر کسی طبقے کو اسلام کے علاوہ کچھ دوسرے نظریات اور زندگی کے دوسرے ضابطے پسند ہیں تو پھر انہیں کھل کر اس امر کا اعلان کرنا چاہیے۔ اسپرٹ سرکے اور شراب سے بھری ہوئی بوتلوں پر شہد کے لیبل لگا کر انہیں اب عوام میں بطور شہد بیچنا ممکن نہیں رہا۔

اسی ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اب ملکی استحکام، قومی یک جہتی، مضبوط مرکز، اتحاد و اتفاق اور ایثار و قربانی کی کھوکھلی اپیلوں میں کوئی وزن باقی نہیں رہا۔ بیرونی خطرات کے خوف کا ہتھیار بھی اب بالکل کند ہو چکا ہے۔ لوگ ان میں سے کسی کو بھی اب قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ سالوں کے تلخ تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ محض الفاظ کے خوشنما پیکر ہیں جن میں برسر اقتدار گروہوں کی خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔ اگر ملکی استحکام ان طبقوں کو بھی فی الحقیقت عزیز ہے اور ایثار و قربانی میں وہ خود بھی یقین رکھتے ہیں تو وہ اس مقصد کی خاطر پہلے خود کیوں ایثار پر آمادہ نہیں ہوتے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر کسی نیک

مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا یقیناً قابل ستائش طرزِ عمل ہے لیکن عوام اس ایثار کا اس وقت مظاہرہ کرتے ہیں۔ جب رہنما نے خود اپنے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے ہوں۔ ہمارے حکمراں اور ان کے حاشیہ نشین خود تو ہر وقت مادی مفادات کے حصول میں منہمک رہتے ہیں مگر عوام کو ایثار و قربانی کا وعظ سنایا جاتا ہے۔ اس قسم کے وعظ آج تک کبھی موثر ثابت نہیں ہوئے بلکہ اس انداز کی تلقین کرنے والوں کے خلاف حقارت ونفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی نصیحت سب سے زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے جس پر خود ناصح عمل پیرا ہو۔ ورنہ وہ عوام کے نزدیک الفاظ کی بازیگری بن کر رہ جاتی ہے۔

نصب العین کے تعین کے بعد اصلاحِ حال کے لیے دوسری بڑی چیز اُس طریقِ کار کا تعین ہے جس کے مطابق حکومت کرنے والے ہاتھوں کو قوم حسبِ خواہش تبدیل کر سکے۔ ہمارے ہاں چند حضرات کی خود غرضی اور عاقبت نااندیشی کی وجہ سے اقتدار ایک ایسا مضبوط حصار بن چکا ہے جس میں جب کوئی فرد یا گروہ ایک مرتبہ گھس جاتا ہے تو اپنے آپ کو رائے عامہ کے اثرات سے یکسر محفوظ پاتا ہے اور بڑی بے خوفی کے ساتھ من مانی کارروائیاں کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو فرد یا گروہ بھی قوت و طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے صبر آزما کام کرنے کے بجائے کسی نہ کسی طرح تختِ اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ قوت کا مرکز اس کے ہاتھ میں آ جائے۔

ہمارے ملک کے باشندوں کے ذہنوں میں جب تک یہ خیال پوری طرح راسخ نہ ہو گا کہ قیادت اور سربراہی صحیح ہے جس کی پشت پر عوامی تائید ہو، اُس وقت تک ہمارے ہاں کسی پائیدار اجتماعی زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کی تصریح کی ہے کہ اگرچہ وہ رہنمائی خدا سے حاصل کرتے ہیں مگر وہ انسانی برادری ہی کے ایک فرد ہیں اور انسانی معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے انہیں رسالت کے کام پر مامور کیا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ قیادت کے منصب پر فائز ہونے اور اس کی اصلاح کے لیے صحیح خطوط پر جدوجہد کرنے کے لیے یہ چیز ازبس ضروری

ہے کہ قائد اور سربراہ عوام کے ساتھ مشترک انسانی جذبات کے رشتوں میں بندھا ہو۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ صرف ذہنی اعتبار سے نہیں بلکہ جذبہ و احساس کے لحاظ سے بھی اُسے اس بات کا پوری طرح علم ہو کہ عوام کن کن مصائب میں گرفتار ہیں۔ کون کون سے اخلاقی اور روحانی عوارض انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں اور انہیں ان مصائب اور عوارض سے نجات دلانے کے لیے کس قدر محنت اور ایثار درکار ہے۔ پھر وہ اس انتہائی نازک ذمہ داری کو صدق دل کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ بھی ہوں۔ صرف ایک جست لگا کر عوام کی گردنوں پر مسلط ہو جانے سے تو اس فرض کو اچھی طرح سر انجام نہیں دیا جا سکتا جب بھی تسلط کا یہ آسان اور سہل راستہ اختیار کیا جائیگا تو پھر مسلط ہونے والوں کی ساری توجہ صرف اسی بات پر مرکوز رہے گی کہ کسی نہ کسی طرح تسلط کے دَور کو زیادہ سے زیادہ طویل کیا جائے اور عوام کی گردنوں پر ایسے مضبوط پنجے گاڑے جائیں کہ وہ کبھی بھی آزاد نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے جبر و استبداد کے سارے حربے استعمال کیے جائیں گے۔ لیکن اس قسم کا تسلط عوام اور اُن کے قائدین دونوں کے لیے تباہ کُن ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم قیادت و سیادت کے اس آسان اور سستے نسخے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس عظیم منصب پر فائز ہونے کے لیے ہم کوئی محنت طلب اور طویل جدوجہد کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتے بلکہ کسی موزوں موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ حالات ذرا ساز گار ہوں اور وہ جھٹ سے تختِ شاہی پر متمکن ہو جائیں۔ اس بنا پر وہ عوام کی خدمت کے بجائے ہمیشہ حالات کے مدوجزر کو دیکھتے ہیں اور جونہی مناسب موقع پاتے ہیں عوامی احساسات کی لہروں کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ بہہ کر ساحل مراد پر جا پہنچتے ہیں۔ انہیں کبھی اس بات کی فکر دامنگیر نہیں ہوتی کہ وہ ان بپھری ہوئی لہروں میں اعتدال پیدا کر کے انہیں ایک مستقل قوت کی شکل میں منظم کریں اور پھر ان سے تعمیر کا کام لیں۔ انہیں اِن کی تندی و تیزی سے ہی غرض ہوتی ہے اس لیے وہ ان سے اُس وقت تک فائدہ اٹھاتے ہیں جب تک کہ ان میں شدید اضطراب موجود ہو مگر جونہی ان لہروں کا اضطراب ختم ہونے لگتا ہے تو اس سے کام لینے والے بھی ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہم اپنے فرض میں کوتاہی کریں گے اگر ہم اس ملک کی قیادت کی خدمت میں یہ عرض نہ کر دیں کہ خدا نے اسے عوامی مقبولیت کے جو زرّیں مواقع فراہم کیے ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے کوئی ایسا ٹھوس لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے جس سے ملک و ملّت کو کوئی پائیدار فائدہ حاصل ہو اور عوام کی اس انداز پر تربیت ہو سکے کہ ان کے اندر اپنے حقوق اور فرائض کا احساس ایک نہ بجھنے والے شعلے کی طرح ہمیشہ موجود رہے اور انہیں سرگرم رکھے۔ اس کام کے لیے طویل محنت، شدید ریاضت اور بے مثال قربانی کی ضرورت ہے۔ زندگی نہ بھڑکنے کا نام ہے، نہ بُجھ جانے کا، بلکہ سُلگتے رہنے کا نام ہے۔ چنانچہ عوامی تحریکات کے جو شعلے آناً فاناً بھڑک کر بُجھ جاتے ہیں وہ اپنے پیچھے سوائے راکھ کے چند ذرات کے اور کوئی چیز نہیں چھوڑتے مگر اجتماعی جدوجہد کی وہ لَو جس کے پاس ہمیشہ روشن رہنے کا سامان موجود ہو وہ قوموں کو مدتِ دراز تک نور اور حرارت مہیا کرتی ہے۔ جو قوم اس لَو سے منور ہو اس میں مایوسی کی تاریکیاں کبھی راہ نہیں پا سکتیں۔

اس لَو کو مستقل قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس امر کا التزام کیا جائے کہ وہ روغن ختم نہ ہونے پائے جس سے اس کی زندگی وابستہ ہے۔ یہ روغن نصب العین کی سچی محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہماری قیادت کو اپنی پوری توجہ اس بات پر صرف کرنا چاہیے کہ عوام کا اُن کے نصب العین کے ساتھ بڑا گہرا ربط قائم ہو اور وہ اُن کے قلب و دماغ میں اس طرح رچ بس جائے کہ وہ زندگی کے سارے معاملات کو اسی کی روشنی میں دیکھنے اور اسی معیار کے مطابق پرکھنے کے عادی ہو جائیں۔ جب تک یہ بات پیدا نہیں ہوتی اُن کے فکر و عمل کا دھارا کوئی تعمیری رُخ اختیار نہیں کر سکتا۔

اجتماعی زندگی کے چراغ تو بلاشبہ نصب العین کے عشق سے ہی جلتے ہیں مگر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے اخلاقی بے راہروی کی یورشوں سے بچایا جائے۔ ضبطِ نفس سے عاری قوم طوفان اٹھا سکتی ہے، شورشیں برپا کر سکتی ہے، ہنگامے کھڑے کر سکتی ہے مگر تعمیر و ترقی کا کوئی مستقل اور پائیدار کام نہیں کر سکتی۔ اخلاق ہی سے قوموں کو ایثار اور قربانی کی تربیت ملتی ہے۔ انسان جب تک اپنے نفس کو آئین و ضوابط کا پابند نہیں بناتا اُس

وقت تک وہ کوئی ٹھوس اجتماعی کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جن حضرات نے بھی خلوص کے ساتھ انسانیت کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے انہوں نے اخلاقی اصلاح اور تہذیبِ نفس پر خاص طور پر توجہ دی ہے۔ جب تک نفس کی تہذیب نہیں ہوتی تمدن کا کوئی مضبوط ڈھانچہ کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔

دنیا کے سارے کاموں میں غالباً سب سے زیادہ مشکل کام یہی تہذیبِ نفس کا کام ہے۔ انسان کے لیے سربفلک عمارات اور بڑے بڑے کارخانے تعمیر کر لینا اور کثیر پیداآوری اور زود پیداآوری کے شاندار ریکارڈ قائم کر لینا بلکہ چاند اور سورج پر اپنا قبضہ جما لینا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اپنے آپ کو زندگی کی اعلیٰ و ارفع اقدار کا پابند بنا کر صحیح معنوں میں انسان بنانا ہے۔ اس کے لیے بے حد خلوص، بڑی دلسوزی اور دردمندی اور غیر معمولی تدبر درکار ہے۔ اس کام کی ذمہ داریاں باغبان کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ مشکل ہیں۔ انسانوں کا مالی سب سے پہلے اُن کے قلب و دماغ کو باطل افکار و نظریات کی جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر کے انہیں حق کی قبولیت کے لیے تیار کرتا ہے۔ پھر ان میں صداقت کے بیج بو کر اُن سے پاکیزہ عادات اور صالح اعمال کا گلستان ترتیب دیتا ہے۔

مالی اگرچہ اپنی نگاہ ایک ایک پھول اور ایک ایک کلی پر رکھتا ہے مگر اس کے سامنے پورے گلستان کی ترتیب ہوتی ہے، کیونکہ جب تک پورے ماحول میں نیکی کی مہک موجود نہ ہو اس وقت تک گلستان کے وجود کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بھلائی کے کسی کام کو بھی مؤثر انداز سے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کے لیے اجتماعی جد و جہد کی جائے۔

ہمارے اس ملک میں سیاسی یا دینی جماعتوں کے الگ الگ وجود کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں جو ایک عام انقباض سا پایا جاتا ہے وہ ایک غلط اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کسی جماعت کا الگ وجود ہی افتراق کی علامت ہے۔ اور یہ ہر صورت میں اجتماعی مفاد کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ یہ نقطۂ نظر درحقیقت یورپ میں اجتماعی حکڑبندیوں اور یک جماعتی ریاست کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی جماعت ملت کے اندر انتشار پیدا کرنے کے لیے قائم کی جاتی ہے تو وہ واقعی خطرہ ہے اور

جتنی جلدی وہ ختم ہو جائے اتنا ہی ملّت کا فائدہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہر جماعت لازمی طور پر افتراق پیدا کرنے کے لیے معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ جماعت ایک اجتماعی قوت کا نام ہے۔ اس سے نہایت اچھے مقاصد بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ خصوصاً انسانوں کی تربیت کے لیے تو جماعتوں کا وجود ہمیشہ ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوا ہے۔ اگر ان کے قیام کا مقصد نیک ہو تو ان کی حیثیت ملّت کی کیاریوں کی سی ہوتی ہے جو سب مل کر اس کی اجتماعی فضا میں حسن پیدا کرتی ہیں۔

ہر انسان اپنا ایک الگ مزاج اور سوچنے سمجھنے کا ایک جداگانہ انداز لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے ماحول میں لے آئے جو اُس کے مزاج اور اندازِ فکر سے مناسبت رکھتا ہو تاکہ اُس کی ذہنی صلاحیتیں بر و مند ہو سکیں۔ اگر وہ اکیلا رہے گا تو دونوں صورتوں میں ایک صورت بہرحال اُسے پیش آئے گی یا تو اُس کی شخصیت بے جان رہے گی کیونکہ انسان اجتماعی سرگرمیوں کے جتنا قریب ہوا سی نسبت سے اُسے غذا حاصل ہوتی ہے یا پھر وہ اتنا خود پسند اور انا پرست ہو گا کہ اجتماعی زندگی کی کسی ذمہ داری کو وہ کامیابی کے ساتھ قبول نہ کر سکے گا اور وہ ہمیشہ اس امر کا خواہاں رہے گا کہ پوری قوم بلکہ پوری انسانیت اس کی تابع ہو اور ہر فرد اُس کی ہر خواہش کا احترام کرے۔ یہ دونوں حیثیتیں ایک غیر متوازن زندگی کا اظہار ہیں۔ شخصیت کی صحت مندانہ تعمیر کے لیے اجتماعی زندگی کی ذمہ داریاں قبول کرنا ازبس ضروری ہے۔ ان سے ایک طرف فرد کو اجتماعیت کی قوت و توانائی حاصل ہوتی ہے اور دوسری طرف حیاتِ اجتماعی میں اُسے کسر و انکسار کے ساتھ جینے کا ڈھنگ آتا ہے۔ جماعت اُس کے لیے سہارا اور طاقت کا منبع بنتی ہے اور وہ جماعت کے لیے ایثار اور قربانی کرنے کے انداز سیکھتا ہے۔ جماعت صحیح معنوں میں ایک تربیت گاہ ہے جو اس کے فکر و احساس میں اعتدال پیدا کرتی ہے اور اُسے دنیائے عمل میں یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان کو دوسرے افراد کے ساتھ مل کر چلنے اور جد و جہد کرنے کے لیے افکار و نظریات میں کس نوعیت کی وسعت اور دوسروں کے جذبات کے بارے میں کس درجہ کا احترام درکار ہے۔ اپنی شخصیت کے صحیح تحفظ اور انا پرستی اور خود پسندی کے مرض سے بچنے کے لیے اجتماعی زندگی کی ذمہ داری قبول کرنے سے زیادہ کوئی مؤثر تدبیر نہیں۔

اپنی بھلائی کے علاوہ خود امت کی بھلائی بھی اس میں ہے کہ افراد اپنی انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ جماعتوں کے ساتھ منسلک ہو کر امت کی بہتری کے لیے کوشش کریں۔ اگر مرض ایک ہو یا انحطاط کسی مخصوص گوشے میں ہو یا اصلاح کی ضرورت کسی ایک شعبے میں ہو تو ایک جماعت سے کام چل سکتا ہے۔ مگر جہاں امراض لاتعداد ہوں اور وہ زندگی کے سارے گوشوں میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہوں اور ہر زاویۂ نگاہ اور ہر پہلو سے اصلاح کی اشد ضرورت ہو تو ان حالات میں عملی طور پر یہی بات ممکن ہے کہ مختلف جماعتیں اصلاحِ حال کے لیے سرگرم عمل ہوں اور جس جس میدان میں وہ زیادہ مؤثر طریق سے کوشش کر سکتی ہیں اُسی میدان میں جدوجہد کریں۔ البتہ اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ اُن سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو ملت کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ اگر ان جماعتوں میں خلوص اور امت کے وسیع تر مفاد کا احساس موجود ہو گا تو ان کی کوششوں سے ملت کی بھلائی ہی ہو گی خواہ ان کوششوں کا انداز جدا گانہ اور دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے درمیان اختلاف کے باوجود امت کی خیر خواہی کے معاملے میں اتفاق و اتحاد ہو گا اور آپس میں اشتراکِ عمل کی راہیں نکلتی رہیں گی۔

قومی قیادت پر اس وقت جو ایک اور اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ معیشت کے موجودہ نظام میں اساسی تبدیلی ہے۔ اس وقت ملک میں جو نظام رائج ہے وہ سرمایہ داری کی بنیاد پر قائم ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ سرمایہ کو معاشی ڈھانچے کی اصل قرار دے کر محنت کشوں کی قدر متعین کی جائے۔ یہ پورا نظام لوٹ کھسوٹ پر قائم ہوتا ہے اور اس میں سرمایہ دار طبقوں کو استحصال کی کھلی چھوٹ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ زرداروں کو غریب طبقوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے کھلے مواقع حاصل ہوں اور وہ ان کی مشقت کے ثمرات کا نہایت ہی معمولی حصہ اُن کی طرف منتقل کریں اور باقی بیشتر حصہ خود سنبھالے جائیں۔ اشتراکی سرمایہ داروں کے اس طرزِ عمل کو ناجائز انتفاع سے تعبیر کرتے ہیں اور سرمایہ داری میں یہ طریق کار تشکیلِ سرمایہ (CAPITAL FORMATION) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کے حامی اس کے جواز میں یہ کہتے ہیں کہ دولت جب تک چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ آجائے اس وقت تک مزید سرمایہ کاری کس

طرح ہو سکتی ہے۔ اشتراکی اس ناجائز دولت کو جسے وہ اپنی اصطلاح میں قدرِ زائد (SURPLUS VALUE) کے نام سے پکارتے ہیں۔ افراد کی تحویل میں دینے کے بجائے حکومت کی تحویل میں دینے پر اصرار کرتے ہیں چنانچہ اگر دقّت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان دونوں کے مابین اختلاف مقصد کا نہیں بلکہ تدبیر منزل کا ہے۔ دونوں نظاموں میں اصل اہمیت بے جان سکوں کو ہی حاصل ہے اور انسان ان کے مقابلے میں کسی قدر و قیمت کا حامل نہیں سمجھا جاتا۔

اس وقت اس ملک میں چونکہ سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہے اس لیے اس کی ساری لعنتیں ہمارے معاشرے پر پوری طرح مسلط ہیں۔ ملکی دولت کا ۸۰ فیصد حصہ صرف بیس خاندانوں کی تحویل میں ہے اور وہ بنی اس دولت کے بل بوتے پر محنت کشوں کا خون نہایت بُری طرح سے چوس رہے ہیں۔ یہ خاندان امورِ مملکت میں بڑے مؤثر انداز میں شریک ہیں اور قانون، پولیس اور دوسری انتظامی مشینری ان کی پشت پناہی کے لیے وقف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک نہایت مختصر سے طبقے کو تو زندگی کی ساری آسانیاں اور سہولتیں میسر ہیں مگر باشندگانِ ملک کی عظیم اکثریت کے لیے جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنا ایک دردناک عذاب معلوم ہوتا ہے۔

اشتراکیوں کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی اجتماعی تعمیر میں سرمایہ کو اہمیت تو یہی حاصل رہے مگر محنت کشوں کا خون چوسنے کا کام چند افراد سے لے کر حکومت کے سپرد کر دیا جائے۔

اس وقت ملک میں ان دونوں نظاموں کے حامیوں کے درمیان سخت رسہ کشی ہو رہی ہے۔ عوام سرمایہ داری کی ستم رانیوں اور مظالم سے تنگ آئے ہوئے ہیں اور اصلاح حال کے لیے شدید آرزومند ہیں اور اس بات کے متمنی ہیں کہ ملک میں ان کے ساتھ جانوروں کا نہیں بلکہ انسانوں کا سلوک کیا جائے اور قومی دولت سے انہیں کم از کم اتنا حصہ تو دیا جائے جس سے وہ قدرے آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اُن کے دل میں معاشی ناانصافی کے خلاف سخت نفرت اور حقارت ہے اور وہ اس لعنت سے ہر قیمت

پر نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دوسری طرف جب اُن کی نگاہ اشتراکیت کی ان جکڑ بندیوں کی طرف جاتی ہے جو روٹی کے بدلے انہیں لازمی طور پر قبول کرنا پڑتی ہیں تو وہ ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت ایک عام پاکستانی سخت قسم کے جسمانی اور ذہنی عذاب میں مبتلا ہے اور قائدین ملک سے سراپا سوال بن کر پوچھتا ہے کہ آخر اُن کے پاس اس کے اس درد کا مداوا کیا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس میں ہمارے ملک کے تمام سوچنے سمجھنے والے افراد کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر کے اس معاشی استبداد کو دور کرنے کی فکر کرنا چاہیئے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے انہیں اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا یہ معاشی نا انصافی اس ملک کے رہنے والوں کا مقدر بن چکی ہے اور اس سے نجات کی کوئی اور صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ پوری قوم کو سرمایہ دار کے استبداد سے نکال کر مملکت کے استبداد کے حوالے کر دیا جائے۔ جب تک سرمایہ معاشی نظام کی اساس رہے گا۔ اس وقت تک ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت کبھی سامنے نہ آ سکے گی۔ لیکن یہ سخت نادانی ہوگی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تیسری کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔

اسلام نے نوع انسانی کو جو اقدارِ حیات دی ہیں انہوں نے معاشی دائرے میں یہ عظیم انقلابی تصور پیش کیا ہے کہ معیشت میں اصل اہمیت سرمایہ کو نہیں بلکہ ذی روح انسان کو حاصل ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کی جا سکتی ہے جو ہر قسم کے استحصال اور جبر و استبداد سے پاک ہو۔ یہ اگرچہ ایک مشکل کام ہے، لیکن اگر اس تصور کی اساس پر ایک صحیح لائحہ عمل تیار کر لیا جائے تو یہ نہ صرف اہل پاکستان کے دکھوں کا علاج ہوگا بلکہ سرمایہ داری کے رُوح فرسا مظالم اور اشتراکیت کے دردناک عذاب سے نوعِ انسانی کو نجات دلا سکے گا۔ خدا کرے کہ ہماری قیادت خلوص نیّت کے ساتھ اس عظیم کام کی طرف بھی متوجہ ہو۔

دَورِ حاضر کا چیلنج اور اسلام

لندن کے استقبالیہ کا خُطبہ اور اس کا جواب

[مسلمانانِ انگلستان نے اتوار ۱۰ رنومبر ۱۹۶۸ء کو مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے اعزاز میں ہوٹل ہلٹن لنڈن میں ایک استقبالیہ دیا تھا۔ یہ استقبالیہ انگلستان میں مقیم مسلمانوں کی ایک استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی میں پاکستان کے علاوہ ترکی، عراق، لیبیا، شام، ویسٹ انڈیز، قبرص، سیلون، ملائیشیا، مصر، نائیجیریا، مارشیس، ٹرینی ڈاڈ اور خود انگلستان کے مسلمانوں کے نمایاں اصحاب شامل تھے۔ یہ استقبالیہ ہوٹل ہلٹن کے دالانِ ضیافت (BANQU ET HALL) میں منعقد ہوا۔ سوا تین سو مہمان اس میں شریک ہوئے شرکا میں اردن، سوڈان اور یمن کے سفیر، سعودی عرب کے کونسلر، ٹرینی ڈاڈ کے فرسٹ سکرٹری، انڈونیشیا کے فرسٹ اسسٹنٹ سیکرٹری اور دوسرے سفارتی نمائندے شامل تھے۔ مستشرقین اور ماہرینِ تعلیم میں سے پروفیسر برنارڈ لیوس ایڈیٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ڈاکٹر ٹنکر پروفیسر سیاسیات و معاشیات لندن یونیورسٹی، پروفیسر مکنگھم اسکول آف اورینٹل اینڈ عربیک اسٹڈیز لندن یونیورسٹی، کرنل وہیلر سنٹرل ایشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مسٹر اسٹیر ڈنکن مڈل ایسٹ آرکائیوز، پروفیسر حیدری اور ڈاکٹر ٹیلر صدر شعبۂ تقابلِ مذاہب برمنگھم یونیورسٹی وغیرہ تشریف لائے تھے۔ برطانوی صحافت کے اہم نمائندوں میں سے گارڈین، ڈیلی مرر، ڈیلی ٹیلیگراف، دی سَن، ایوننگ نیوز، بی بی سی (لندن و برمنگھم)، ویٹرن نیوز ٹی وی، اور اہم پاکستانی اخبارات میں سے ڈان، نوائے وقت، مارننگ نیوز اور حریت وغیرہ کے نمائندے، نیز انگلستان سے شائع ہونے والے تقریباً تمام اُردو اخبارات و رسائل کے نمائندے شریک تھے۔ ان کے علاوہ انگلستان میں مقیم تمام اسلامی ممالک کے نمایاں اصحاب بھی وہاں موجود تھے جس کی وجہ سے یہ ایک اہم بین الاقوامی

اجتماع بن گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق ٹھیک ساڑھے چھ بجے کارروائی شروع ہوئی۔ چائے نوشی کے بعد لیبیا کے نوجوان مسٹر عاشور شامس نے تلاوتِ قرآن پاک کی۔ پھر متحدہ عرب جمہوریہ کے ڈاکٹر صلاح شاہین پروفیسر گلاسگو یونیورسٹی نے استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ خطبہ انگریزی زبان میں تھا۔ پھر مولانا محترم نے اس کا جواب اُردو میں دیا

اور پروفیسر خورشید احمد صاحب نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اس پروگرام کے بعد معززین نے مولانا سے ملاقات کی۔ یہ سلسلہ ۹ بجے تک چلتا رہا۔ ذیل میں اس خطبہ اور اس کے جواب کو درج کیا جا رہا ہے۔]

خطبۂ استقبالیہ

برادرِ محترم!

آج کی شام ہم انتہائی جذباتِ مسرت کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ ہم اللہ قادرِ مطلق کے شکر گزار ہیں کہ اس نے دو بڑے نازک آپریشنوں کے بعد آپ کی صحت کو تیزی سے بحال فرما دیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ وقوتِ وافرہ عطا فرمائے تاکہ آپ اعلائے کلمۃ اللہ کی خدمت سرانجام دیتے رہیں۔

آپ کا ہمارے درمیان اس ساعت موجود ہونا ہم سب کے لیے ایک عظیم سعادت ہے۔ چشمِ تصور کے سامنے نصف صدی سے زاید کے مناظر گھوم پھر رہے ہیں۔ اُس وقت نظریاتی اضمحلال اور سیاسی اختلال کے باعث ہمارے لیل و نہار کتنے تیرہ و تار تھے ؛ وہ تمام مثالی اقدار و مناہج جن کے لیے امتِ مسلمہ اپنی پوری تاریخ میں سینہ سپر رہی ، وہ انحطاط کا شکار ہوتے نظر آ رہے تھے۔

لیکن اس کے بعد حالات پلٹا کھاتے ہیں۔ تجدید و احیائے اسلام کی تحریک اٹھتی اور برپا ہوتی ہے اور حیاتِ نَو کے آثار چار سُو پھیلتے نظر آتے ہیں۔ ذہنی اُفق پر تشکیک و اعتذار کی روش رخصت ہوتی ہے اور دینی حمیت اور خود اعتمادی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ پراگندگیٔ فکر اور ژولیدگیٔ دماغ کے تانے بانے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور اسلام کی خالص اور بے آمیز تعلیمات عقلی تقاضوں اور عصرِ جدید کے مطالبوں کا موزوں جواب بن کر پیش کی

جاتی ہیں۔ اسلام اب محض پوجا پاٹ یا مراسم عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بنی نوع انسان کے لیے ایک انقلاب انگیز پروگرام ہے۔ یہ اخلاقی ارتقاء اور اجتماعی تنظیم کے لیے ایک الہامی نظامِ فکر ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ یہ انسان کی شخصیت کو ایک متعین سانچے میں ڈھالتا ہے، زندگی کی گزرگاہوں میں اس کی حفاظت کرتا ہے اور ایک پاکیزہ اور پُروقار زندگی بسر کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔

یہ انقلابی تحریک بُرائی اور باطل کو ہر محاذ پر للکارتی اور چیلنج دیتی ہے اور انسانیت کو ایک نظامِ نو کی تعمیر کے لیے دعوت اور پیغام دیتی ہے۔ یہ ایک عمومی دعوت ہے جو پُوری نوعِ انسانی کو خطاب کرتی ہے۔ تاہم اس دعوت کا آغاز اور اس کا ردِّعمل چونکہ اسلامی دنیا میں ہُوا ہے، اس لیے قدرتی طور پر عالمِ اسلام ہی اسلامی تحریک کا اوّلین میدانِ کارزار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسلامی دنیا کے بعض حصّوں میں حالات کی رفتار اطمینان بخش نہ ہو، لیکن اس عالمگیر تحریک کا وجود میں آجانا، عزائم و توقعات کا سینوں میں بیدار ہوجانا اور اس راہ میں گرانقدر قربانیوں کا پیش کیا جانا، یہ سب اس بات کی علامت ہیں کہ ایک نیا دَور شروع ہو چکا ہے۔

آج کی شام خاص طور پر اپنے اس ماضی قریب پر ہماری یہ نگاہِ بازگشت ایک قدرتی امر ہے جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو اس تحریکِ احیائے دین کا ایک خصوصی علمبردار ہونے کا فخر حاصل ہے۔ آپ نے اسلامی افکار و نظریات کے ذخائر میں نمایاں اور قابلِ رشک اضافہ کیا ہے۔ آپ نے نشاۃ و تجدید کی طاقتوں کو اصلاحِ اخلاق اور سماجی تعمیرِ نَو کی ایک مثبت تحریک کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ آپ نے جملہ مواقع بطویل قید و بند حتیٰ کہ سزائے موت کا سامنا عدیم النظیر جرأت اور عظیم ضبط و تحمل سے کیا ہے۔ آپ نے راہِ حق پر گامزن ہونے والوں کے لیے ایک تابناک اور درخشاں مشعل روشن کر دی ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ سب اللہ کی عنایت ہے اور اُسی کی ذات حمد و ثنا کے لائق ہے۔

لیکن اس تاریک ماضی سے خلاصی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے حال کی تلخیوں میں کسی طرح کی کمی واقع ہوگئی ہے یا مستقبل کی مشکلات آسان ہوگئی ہیں۔ ہمیں نہایت سنگین حالات سے سابقہ درپیش ہے۔ یہاں سے تاریخِ انسانی ایک نیا موڑ مڑے گی یا پھر انسانیت کے تحفظ و بازیابی کے سارے امکانات کا خاتمہ ہوجائے گا۔

انسان آج اپنی فتوحات کے اوجِ کمال پر ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدوں کو پامال کرتا نظر آتا ہے۔ قوائے فطرت

کی تسخیر میں اسے بے حد وحساب کامیابی ہو رہی ہے۔ مادّی نکاثر و ترقہ کا ایک عالم اس کی دسترس میں ہے۔ طب و معالجہ کے فن میں اتنی ترقی ہو چکی ہے گویا کہ مرض و الم کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ اقتصادی ارتقاء کا یہ حال ہے کہ اگر انسان چاہے تو غربت و فاقہ کا استیصال ہو سکتا ہے۔ خلا پیمائی کا علم و فن چاند پر کمند پھینک رہا ہے۔

بلاشبہ یہ بڑے کارنامے ہیں لیکن اس سے انسان کی انسانیت و آدمیت میں کوئی ترقی و اصلاح نہیں ہوئی۔ طاقت میں اضافے سے دانش و بینش، نیکی اور بھلائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ باہر کی دنیا کا فاتح اپنے نفس کو مفتوح و مغلوب نہیں کر سکا۔ لہٰذا یہ امر باعثِ تعجب نہیں ہے کہ اس کامیابی کی ساعت میں خود انسان ہی عظیم ترین خطرے کی زد میں ہے۔ یہ اپنے بناتے ہوئے آلات و اسلحہ کے رحم و کرم پر ہے، کیونکہ زندگی کا کوئی بہتر و برتر مقصد اور مشن اس کے پاس نہیں ہے۔ ذرائع و وسائل پر اُسے قابو حاصل ہے مگر مقاصد و اقدار کا رشتہ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مادّی ثروت افلاس و استحصال کو ختم کرنے میں ناکام ہے۔ بلکہ اس کے برعکس قوموں کی سطح پر بھی اور افراد کے مابین بھی امیر و غریب کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ عائلی زندگی مائل بانتشار ہے۔ تقویٰ اور احساس ذمہ داری کی جگہ اباحیت اور تعیّش پرستی لے رہی ہے۔ تشدد اور جرم و فساد اپنے عروج پر ہے۔ انتہا پسندی کا دَور دورہ ہے۔ علائق میں کشیدگی، چپقلش اور آویزش میں بے حد اضافہ ہو چکا ہے۔ ووٹ کی پرچی کی جگہ بندوق کی گولی لینے کی کوشش کر رہی ہے۔

انسان نے جس سوسائٹی کو خود جنم دیا ہے، اس میں وہ اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ جس کنبے میں پیدا ہوا تھا، اس سے کٹ چکا ہے۔ اپنی مادر علمی، اپنے کاروباری حلقے، غرض یہ کہ اپنے جس ماحول اور دنیا میں وہ پروان چڑھا تھا، اس سے اس کا رشتہ کلیتہً منقطع ہو چکا ہے۔ وہ ایک ہجوم میں تنہا، بلکہ اپنے گھر میں بیگانہ بن گیا ہے۔ اگرچہ ٹیکنولوجی کے اعتبار سے پوری دُنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں مگر انسان ابھی تک قومیت، وطنیت اور نسلیت کے بتوں کا پجاری ہے۔ امن و امان ناپید اور عدل و انصاف ایک سراب ہے۔ انسان اپنے بنائے ہوئے تناقضات و تضادات کا صیدِ زبوں بن چکا ہے۔ وہ ایک طرف فقمندی مگر دوسری طرف دہشت، ایک طرف کاروانی مگر دوسری طرف اذیت کے چنگل میں ہے۔

سوال یہ ہے، کیا اس متوقع آفت اور سیلاب بلا کو کسی طرح ٹالا جا سکتا ہے؟ کیا انسان اپنے اس تیار کردہ قفس سے رہائی پا سکتا ہے؟ کیا وہ اپنی جبلّی نیک طینتی کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اور از سرِ نو ایک شریفانہ و

عادلانہ معاشرے کی تعمیر کر سکتا ہے۔

ہمارے عزیز بھائی!

ہم آج کی شام جب اپنے خیالات کا مخاطب آپ کو بنا رہے ہیں، تو ہمارے ذہن میں آپ کی وہ عظیم الشان خدمات تازہ ہو رہی ہیں جو آپ نے عالمِ اسلام کی فکر و نظر کی بیداری کے ضمن میں انجام دی ہیں اور ہم آپ کی قیادت اور رہنمائی کے منتظر ہیں۔ ہماری دُعا اور تمنا ہے کہ موجودہ مخمصے سے نکلنے کی راہ انشاء اللہ موجود ہے۔

ہم اپنے ساتھ یہ شام گزارنے پر آپ کے دوبارہ شکر گزار ہیں اور اللہ سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو اسلام اور انسانیت کی خدمت بجا لانے کی بیش از بیش طاقت و ہمت عطا فرمائے۔

جواب

حمد و ثناء کے بعد۔ جنابِ صدر، ارکانِ مجلسِ استقبالیہ اور معزز حاضرین۔

سب سے پہلے میں اس بات پر معذرت چاہتا ہوں کہ بیٹھ کر آپ سے خطاب کر رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ کو خطبۂ استقبالیہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ پچھلے ماہ ستمبر اور اکتوبر میں مجھے دو بڑے آپریشنوں سے گزرنا پڑا ہے، اور ابھی میں اتنا کمزور ہوں کہ چند منٹ سے زیادہ کھڑا نہیں رہ سکتا اور مسلسل زیادہ دیر تک بول بھی نہیں سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ ہیں پہلی مرتبہ انگلستان آیا بھی تو بیماری کی حالت میں آیا۔ انگلستان کے دوسرے مقامات پر جانا تو درکنار مجھے خود لندن بھی اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ نہ یہاں کے بڑے بڑے ادارات میں جا سکا، نہ یہاں کے اہلِ علم سے مل سکا اور نہ اپنے بھائیوں کی اِس خواہش کو پُورا کر سکا کہ اُن کے اجتماعات میں شریک ہوں۔ میں مجلسِ استقبالیہ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ اس نے یہ تقریب منعقد کی جس کی وجہ سے آج کم از کم مجھے آپ حضرات سے ملنے اور تھوڑی بہت اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔

مجلس استقبالیہ کا میں اس بنا پر بھی بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے تحریکِ احیائے اسلام کے سلسلہ میں میری ناچیز خدمات کی قدر افزائی خود اُن خدمات سے بہت زیادہ کی ہے۔ درحقیقت میرے لیے بڑے سے بڑا فخر بس یہی کافی ہے کہ میں اللہ کے دین کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ مجھے اپنے متعلق کبھی یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں نے

کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ فی الواقع یہ میرے مخلص بھائیوں کی اسلام سے محبت ہے جس کی بنا پر وہ کسی آدمی کو اسلام کی تھوڑی بہت خدمت بھی کرتے دیکھتے ہیں تو اس کی حیثیت سے زیادہ اس کی قدر افزائی کرتے ہیں۔ ان کے اس مخلصانہ جذبے کو دیکھ کر یہ توقع بندھتی ہے کہ احیائے اسلام کی تحریک کو جن ناموافق حالات میں نئی نسل کے پیشرو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، انشاء اللہ آئندہ نسل اس سے بہت زیادہ خدمات انجام دے گی اور انشاء اللہ اس تحریک کا مستقبل روشن ہوگا۔

حضرات! مجلس استقبالیہ کے اس خطبہ میں پچھلے پچاس سال اور اس سے پہلے کے جن حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ درحقیقت کچھ غیر متوقع حالات نہ تھے۔ مسلمانوں کو انیسویں صدی میں جو پے در پے زکیں پہنچی تھیں ان کی بدولت اچانک انہوں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ مشرق سے لے کر مغرب تک وہ اہلِ مغرب کے غلبہ اور استیلاء سے مغلوب ہو چکے تھے۔ فطری طور پر اس کا پہلا ردِعمل وہی کچھ ہونا تھا جو ہوا، جس کا ذکر آپ نے اپنے اس خطبۂ استقبالیہ میں کیا ہے۔ اُن کو یکایک ایک ایسی تہذیب سے سابقہ پیش آیا تھا جو صرف اپنے فلسفہ اور سائنس ہی کو لے کر نہیں آئی تھی، محض اپنے اخلاقی، تمدنی اور معاشی نظام کو لے کر بھی نہیں آئی تھی بلکہ ان سب چیزوں کی پُشت پر توپ اور بندوق بھی تھی اور ان کی پُشت پر سیاسی اقتدار بھی تھا جس سے مسلمان خود اپنے گھر میں غلام بن کر رہ گئے تھے۔ اس نوعیت کے غالب و قاہر فلسفۂ زندگی سے جب یکایک ان کو سابقہ پیش آیا تو انہوں نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہوں نے انتہائی شکست خوردگی کے ساتھ اس کی بالاتری کو تسلیم کر لیا۔ ان کے اندر یہ جرأت باقی ہی نہ رہی کہ اس کو تنقید کی نظر سے دیکھتے۔ وہ صرف جسم ہی کے اعتبار سے نہیں، عقل و فکر اور رُوح کے اعتبار سے بھی مفتوح ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ فاتح کے نظریات و افکار تو ہر غلطی سے مبرا ہیں۔ غلطی کا امکان اگر ہے تو مفتوح کے نظریات و افکار میں ہے۔ تہذیب اگر صحیح ہے تو فاتح کی تہذیب ہے۔ بدلنے کے قابل صرف مفتوح کی تہذیب ہے جسے فاتح کی تہذیب کے معیار پر ڈھالا جانا چاہیے۔ علم اور تحقیق کے نام سے فاتح جو کچھ لا رہا ہے وہ گویا اٹل حقائق ہیں جن میں کسی نقص کا امکان نہیں۔ ترمیم کے قابل صرف مفتوح کے عقائد ہیں جو اس علم و تحقیق سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ فاتح کا ہر اعتراض جو وہ مفتوح کے مذہب، تاریخ اور تمدن پر کرے، بجائے خود بالکل بجا ہے۔ مفتوح اگر اپنی عزت بچانا چاہتا ہے تو اسے اپنی ہر اُس

چیز کا انکار کر دینا چاہیے جس پر فاتح نے انگشت نمائی کی ہو۔ جنگ کے میدان میں شکست کھانے اور سیاست کے میدان میں مغلوب ہو جانے کے بعد یہ قدرتی ردعمل تھا جس کے زیر اثر انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے دورِ اوّل میں مسلمانوں کے اہلِ علم اور اہلِ قلم نے مغربی فلسفہ کو حق مان کر اسلامی عقائد میں ترمیم کرنی شروع کی۔ مغربی تہذیب کو بجا و درست سمجھ کر اسلامی تہذیب کی شکل بگاڑنے اور اس کے اندر نئے پیوند لگانے کا سلسلہ جاری کیا، اور اسلام پر اہلِ مغرب کے اعتراضات کو وزنی سمجھ کر ان کے جواب میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کر لیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ان اعتراضات کی حقیقت پر نگاہ ڈالتے اور تحقیق کرتے کہ وہ کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہیں، ان پر یکایک ان اعتراضات کا ردعمل یہ ہوا کہ انہوں نے ہر اُس چیز سے انکار شروع کر دیا جس کی نشاندہی معترضین کی طرف سے کی گئی تھی خواہ وہ درحقیقت ہماری شریعت میں موجود ہو اور خود معترضین اس کو اپنی نادانی سے غلط سمجھ بیٹھے ہوں۔

مثلاً معترضین کی طرف سے جب اسلام کے جہاد پر اعتراض کیا گیا تو مغلوب اور مرعوب ذہن یہ نہ دیکھ سکے کہ یہ اعتراضات کن کی طرف سے آرہے ہیں۔ معترضین وہ لوگ تھے جنہوں نے خود ایشیا، افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا میں ہر طرف جارحانہ جہاد کیا تھا، پورے پورے براعظموں پر قبضہ کر کے کروڑوں انسانوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور بعض علاقوں میں قدیم باشندوں کو قریب قریب بالکل فنا کر دیا تھا۔ ان کے اپنے مذہب میں چونکہ جہاد نہ تھا، اور وہ جہاد کے بغیر دنیا میں رہ بھی نہ سکتے تھے، اس لیے جب انہوں نے جہاد کیا تو ان کے پاس جنگ کے لیے کوئی اخلاقی ضابطہ موجود نہ تھا، کوئی خدائی ہدایت نہ تھی جو ان کو جنگ کی تہذیب سے آشنا کرتی، بلکہ انہوں نے خود اپنے لیے جنگ کے طریقے اپنی خواہشات اور اغراض کے مطابق وضع کر لیے تھے۔ اس وجہ سے جب انہوں نے جہاد کیا تو بعض براعظموں میں پوری کی پوری نسلوں کو مٹا دیا اور مفتوحوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ ان چیزوں پر نگاہ کرنے کے بجائے ہمارے ہاں کے اہلِ علم اور اہلِ قلم نے سرے سے اس بات کا انکار ہی کر دیا کہ ہمارے ہاں جہاد نامی بھی کوئی چیز ہے، اور معترضین کو یہ نہ بتایا کہ اسلامی تعلیم کی برکت سے مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں جنگ کے اندر کبھی وہ وحشیانہ حرکتیں نہیں کیں جو اہلِ مغرب نے کی تھیں اور آج تک کر رہے ہیں، نہ مفتوح قوموں کے ساتھ کبھی وہ برتاؤ کیا جو اہلِ مغرب نے کیا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان معذرت خواہوں

نے گویا معترضین سے یہ کہا کہ جہاد کرنا بس آپ ہی کا حق ہے۔ ہم اس کا حق نہیں رکھتے۔

اسی طرح جب اسلام کے مسئلۂ غلامی پر اعتراض ہوا تو ہمارے ہاں کے اہلِ علم اور اہلِ قلم نے فوراً اس بات کا انکار کر دیا کہ اسلام میں غلامی کا بھی کوئی قانون ہے اور اس کے لیے کچھ ضوابط اور قواعد مقرر کیے گئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض سُن کر کچھ ایسی گھبراہٹ اور خوف زدگی طاری ہوگئی کہ وہ اس معاملہ میں خود معترضین کے طرزِ عمل کا جائزہ لے کر دیکھ ہی نہ سکے۔ معترض وہ لوگ تھے جن کے اپنے دین میں غلامی کے متعلق کوئی ہدایت موجود نہ تھی جس سے ان کو یہ معلوم ہوتا کہ انسان کو غلام کس حالت میں بنایا جا سکتا ہے اور کس حالت میں نہیں بنایا جا سکتا، اور غلام بنانے کے بعد غلاموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ایسے کسی ہدایت نامے کے بغیر انہوں نے اتنے بڑے پیمانے پر غلامی کا کاروبار کیا جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ کئی صدیوں تک افریقہ کے باشندوں پر چھاپے مارتے رہے۔ دس بارہ کروڑ انسانوں کو پکڑ کر لے گئے۔ امریکہ اور ویسٹ انڈیز وغیرہ میں اپنی نوآبادیوں کی آبادکاری کا کام ان سے لیا اور ان کے ساتھ بدترین انسانیت سوز سلوک کیا۔ آج مغربی دنیا میں رنگ کا مسئلہ ان کے اِسی ظلم کی بدولت پیدا ہوا ہے، ورنہ بیچارے افریقہ کے کالے خود امریکہ جمیکا اور دوسرے ملکوں میں پرواز کر کے نہیں گئے تھے۔ ہمارے اہلِ علم اور اہلِ قلم اتنی جرأت بھی نہ رکھتے تھے کہ وہ اسلام کے مسئلۂ غلامی پر اعتراض کرنے والے اہلِ مغرب سے یہ کہہ سکتے کہ حضرات یہ نامۂ اعمال لے کر آپ کا منہ کیا ہے کہ ہم پر حرف زنی کریں۔ وہ وقت تھا ہی کچھ ایسا کہ فاتحین کے اعتراضات سُن کر ہمارے ہاں کے لوگوں پر بدحواسی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اس بات کو نہیں دیکھتے تھے کہ معترض کون لوگ ہیں اور ان کے اعتراض کی حقیقت کیا ہے۔ انہیں تو فاتح کا لگایا ہوا ہر الزام سُن کر اپنی عزت بچانے کی فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ انہوں نے کبھی یہ کہنے کی ہمت نہ کی کہ حضرات ہمارے پاس چونکہ غلامی کے بارے میں ایک اعلیٰ درجہ کا معقول اخلاقی ضابطہ موجود تھا اس لیے ہمارے ہاں کبھی غلاموں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا گیا جو افریقہ کے غلاموں کے ساتھ آپ نے امریکہ اور ویسٹ انڈیز وغیرہ میں کیا ہے۔ آپ کو تو انیسویں صدی میں غلامی کو قانوناً منسوخ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی بھی تو آج تک گورے اور کالے کی تمیز سے آپ نجات نہیں پا سکے ہیں۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں کالوں کے ساتھ جو سلوک آپ کر رہے ہیں وہ غلامی کے طریقے سے ہزار

درجہ بذر ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں غلام بادشاہی کے تخت پر بارہا سرفراز ہوئے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے سپہ سالار غلام ہوئے ہیں۔ اور ہماری تاریخ اُن غلاموں سے بھری ہوئی ہے جنہیں محدّث فقیہ اور امام بننے کا شرف حاصل ہُوا ہے۔

اسی طرح جب ہمارے تعدّدِ اَزواج پر اہلِ مغرب کی طرف سے اعتراض کیا گیا تو ہمارے ہاں کے اہلِ علم اور اہلِ قلم اس پر شرمندہ ہو کر طرح طرح کی معذرتیں پیش کرنے لگے اور انہوں نے آنکھیں کھول کر یہ نہ دیکھا کہ یک زوجی (MONOGAMY) کو قانون قرار دے کر اہلِ مغرب نے ایک بہت بڑی نادانی کا ارتکاب کیا ہے جس کا بدترین خمیازہ وہ آج بھگت رہے ہیں۔ اس کی بدولت ان کے ہاں غیر قانونی تعدّدِ اَزواج نے رواج پایا جو کسی ضابطہ کا پابند نہیں اور جس کے ساتھ کسی ذمّہ داری کا بار نہیں۔ اسی کی بدولت ان پر کثرتِ طلاق کی وبا مسلط ہوئی جو روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اسی کی بدولت ان کے ہاں ناجائز بچوں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ خاندانی نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ برباد شدہ گھروں (BROKEN HOMES) کے بچے ایک پریشان کن مسئلہ بن گئے ہیں۔ اور کمسنی کے جرائم روز افزوں ترقی پر ہیں۔ ان ساری چیزوں کو پیش کر کے معترضین کو شرم دلانے کے بجائے ہم خود اپنے قانونِ تعدّدِ ازواج پر شرمانے لگے اور اس میں ترمیم کرنے پر تُل گئے۔

وہ ایک دَور تھا جو قدرتی اسباب سے ہمارے اوپر آیا تھا۔ اگرچہ وہ ابھی تک بالکل ختم نہیں ہُوا ہے لیکن بہرحال اس کو گزرنا تھا، گزر رہا ہے اور لازماً گزر کر ہی رہے گا۔ ابتدائی مراحل سے نکلنے کے بعد جب ہمارے ہاں ذرا زیادہ گہرے غور و فکر کے ساتھ فلسفہ، سائنس، تاریخ اور مذہب کا مطالعہ کیا گیا تو اس کے بعد ظاہر بات ہے کہ ابتدائی مرعوبیت کی وہ کیفیت باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ ابتدائے اسلام میں بھی جب مسلمانوں کو یونانی اور دوسرے عجمی فلسفوں سے نیا نیا سابقہ پیش آیا تھا تو اس نے اعتزال کی شکل اختیار کی تھی۔ لیکن جب گہرائی کے ساتھ ان چیزوں کا مطالعہ کیا گیا تو آخر کار تنقید اور تحقیق نے اُن ابتدائی تاثرات کو ختم کر دیا اور مسلمانوں کے اندر ایک پختہ نظامِ فکر اور ایک پختہ علمِ کلام وجود میں آیا۔ ایسی ہی صورت اب بھی پیش آ رہی ہے۔ جوں جوں مطالعہ میں وسعت اور تحقیقات میں پختگی پیدا ہوتی جا رہی ہے وہ ابتدائی اثرات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مسلمانوں میں اس طرح کے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو مغربی نظر سے اسلام کو دیکھ رہے ہیں اور

اسلام میں ترمیمات کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں، لیکن اب ہمارے اندر ایسے محققین خدا کے فضل سے موجود ہیں جو اس طرح کی ہر کج فہمی اور ہر اٹھنے والی ترمیمی تحریک کا استیصال کرنے اور مسلمانوں کو غلط فہمیوں سے بچانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

اب میں مختصراً خطبۂ استقبالیہ کے اُس حصہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس میں موجودہ زمانے کی مشکلات اور پریشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اس دَور کی فنی ترقی بھی ہے وہ ساری کی ساری دراصل علوم طبیعی (PHYSICAL . SCIENCES) کی تحقیقات کی بدولت ہے۔ ان علوم کی تحقیقات نے انسان کو غیر معمولی قوتیں دے دی ہیں۔ ان کی بدولت انسان نے عجیب و غریب ایجادات کی ہیں اور ان کے استعمال سے انسانی تمدن و معاشرت اور تہذیب کو غیر معمولی مادی ترقی حاصل ہوئی ہے لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جہاں تک علوم طبیعی کا تعلق ہے، خدا نے انسان کو خود اس کی تحقیق کے ذرائع عطا کر دیئے ہیں اور اس کے اندر وہ قابلیتیں اور صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنے گردوپیش کی موجودات کا مطالعہ کر سکتا ہے، تجربات اور مشاہدات سے ان کے خواص اور ان کے اندر کام کرنے والے قوانین دریافت کر سکتا ہے اور اپنی مادی ترقی کے لیے انہیں زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی خدائی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا نے خود انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے، اِس مادی دنیا پر اس کو اقتدار عطا کر دیا ہے، اس اقتدار کو استعمال کرنے کے ذرائع و وسائل اس کے لیے فراہم کر دیئے ہیں، اور خود انسان کے اندر وہ صلاحیتیں اور طاقتیں پیدا کر دی ہیں جن سے کام لے کر وہ موجوداتِ زمین سے اپنی خدمت لے سکتا ہے۔ مگر جہاں تک تہذیب و تمدن کا تعلق ہے، جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے اور جہاں تک انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے نظام کا تعلق ہے، اس کے بارے میں انسان کو یہ غلط فہمی لاحق ہو جانا صحیح نہیں ہے کہ یہاں بھی وہ اپنی ہی تحقیقات سے زندگی کے صحیح اصول معلوم کر سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی درحقیقت اُن تمام خرابیوں کا بنیادی سبب ہے جو انسانی تہذیب میں راہ پا گئی ہیں۔ یہاں فی الواقع انسان خدائی ہدایت (DIVINE GUIDANCE) کا محتاج ہے۔ خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر انسان اگر اپنے اصول خود وضع کرنے لگے اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ اس پہلو میں بھی اُسے خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے تو وہ

ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے اور محض اپنی عقل و فکر اور تجربات و مشاہدات کے بل پر کوئی صحت مند نظام زندگی تعمیر نہیں کر سکتا۔ یہ غلطی پہلے بھی انسان کو گمراہ کرتی رہی ہے اور آج بھی کر رہی ہے اور اس کا نتیجہ بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس معاملہ میں ایک اور غلطی بھی ہے جو انسان کرتا رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس محدود دائرہ میں کوئی خدائی ہدایت وہ اپنے پاس پاتا ہے صرف اُسی پر وہ اکتفا کرنا چاہتا ہے اور اپنے دائرہ سے باہر جا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ کہیں اور بھی کوئی ہدایت خدا کی طرف سے آئی ہوئی موجود ہے یا نہیں۔ اس کے اپنے معاشرہ میں، اس کے اپنے اسلاف کے ذریعہ سے اگر کوئی خدائی ہدایت اُسے ملی ہے تو وہ صرف اسی پر قناعت کر لیتا ہے۔ پھر جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ ہدایت اسے پوری رہنمائی نہیں دے رہی ہے جس سے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں وہ ایک جامع اور قابلِ عمل نظام مرتب کر سکے اور اپنی زندگی کو صحیح طریقوں پر ڈھال سکے تو وہ سرے سے خدائی ہدایت ہی سے مایوس ہو جاتا ہے اور غیر ضروری سمجھتا ہے کہ اپنے دائرہ سے باہر نکل کر بھی یہ معلوم کرے کہ کہیں اور بھی کوئی خدائی ہدایت زیادہ جامع اور صحیح شکل میں موجود ہے یا نہیں۔ وہ اگر کہیں اور پائی جاتی ہو تو اس کو وہ اجنبی چیز سمجھتا ہے، اس کے اندر عیب نکالنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی قدر گھٹانے میں اپنا زور صرف کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے خدائی ہدایت ہونے کا انکار کرنے کے لیے اسے کوئی بہانہ مل جائے۔ حالانکہ فی الواقع یہ اس کی خود اپنے ساتھ دشمنی ہے۔ ایک انسان کو کھلے دل کے ساتھ دیکھنا چاہیے کہ کہاں حق کی روشنی موجود ہے۔ کھلے دل کے ساتھ اس کو معلوم کرنا چاہیے کہ اگر میرے پاس کوئی روشنی مکمل شکل میں نہیں ہے تو کہیں اور وہ موجود ہے یا نہیں۔ اگر وہ کہیں پائی جاتی ہو یا کوئی اسے پیش کرے تو بغیر کسی تعصب اور بغیر کسی تنگ نظری کے اس کو جانچنا چاہیے۔ قبل از وقت کوئی رائے قائم کیے بغیر اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔ کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے کہ آیا اس سے کوئی ایسی رہنمائی مل سکتی ہے جس سے ہم اخلاق کے صحیح اصول معلوم کر سکیں، جس سے ہم اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے بنیادی مسائل کا حل معلوم کر سکیں، جس سے ہم اپنی زندگی کو زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کر سکیں۔

مَیں سمجھتا ہوں اگر موجودہ زمانے کے اہلِ فکر اپنی اس کمزوری سے نجات پالیں تو سارے انسان خدا کی طرف سے آئے ہوئے ہر اُس نور سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو دنیا میں کہیں آیا ہے۔ ہم اِس کے لیے بالکل تیار ہیں کہ

اہلِ مغرب کے پاس اگر خدا کی طرف سے آئی ہوئی کوئی ہدایت موجود ہو تو اس سے استفادہ کریں جبکہ تحقیق سے ہمیں اس کے خدائی ہدایت ہونے کا اطمینان ہو جائے۔ اسی طرح سے اہلِ مغرب کو بھی چاہیے کہ ہمارے پاس خدا کی جو ہدایت موجود ہے، جس کو ہم ہدایتِ الٰہی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، اس کو بھی وہ اچھی طرح جانچ لیں اور دیکھیں کہ آیا اس کے اندر کوئی ایسی رہنمائی ملتی ہے جس کی مدد سے وہ اپنی زندگی کے نظام کو درست کر سکیں۔

مثال کے طور پر میں عرض کروں گا کہ اس وقت امریکہ، جنوبی افریقہ، رہوڈیشیا اور دوسرے ملکوں میں رنگ و نسل کی تفریق انتہائی شدت اختیار کر گئی ہے اور برطانیہ میں بھی یہ سر اٹھاتی نظر آ رہی ہے۔ یہ ایک بدترین داغ ہے جو انسانیت کے دامن پر لگا ہوا ہے اور مغربی دنیا اپنی معقولیت پرستی (RATIONALISM) کے سارے دعووں کے باوجود اس دھبے کو اپنے دامن سے دھونے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ اب اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلہ کو جس طرح اسلام نے حل کیا ہے دنیا کا کوئی معاشرہ اسے حل نہیں کر سکا ہے۔ آخر تعصب کو چھوڑ کر یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے کہ اسلام کے اصولوں میں وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ کے اندر پوری اسلامی تاریخ میں کبھی رنگ کے مسئلہ نے وہ شکل اختیار نہیں کی جو مغربی معاشرہ میں پیش آ رہی ہے؟

اسی طرح موجودہ تہذیب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ خاندانی نظام بری طرح درہم برہم ہو رہا ہے۔ شوہر اور بیوی، ماں باپ اور اولاد، بھائی اور بہن کے رشتے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ بھرے گھر برباد ہو رہے ہیں۔ کم سنی کے جرائم بے تحاشا بڑھ رہے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے گھروں (BROKEN HOMES) کے بچے پورے معاشرے کے لیے ایک نفسیاتی مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔ ناجائز بچوں کی ولادت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ طلاق و تفریق کی کثرت نے انسانی معاشرہ کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ دیکھنا چاہیے اور انصاف کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں کبھی یہ مسائل اس شکل میں پیدا نہیں ہو سکے۔ آخر کیوں نہ اُن قوانین و ضوابط کا مطالعہ کیا جائے جن کی وجہ سے اِس انتہائی تنزل کے دور میں بھی مسلم معاشرہ اِن لعنتوں سے پاک ہے؟ علمائے مغرب اس سے سبق لینے کے بجائے ہمارے قوانینِ نکاح و طلاق اور ہمارے نظامِ معاشرت پر الٹی نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور اپنے شاگردوں کے ذریعہ سے ہمیں بھی وہ بیماریاں لگانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ان کے معاشرے کو تباہ کر رہی ہیں حالانکہ انہیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ہمارے قوانین اور

قواعد کے اندر کیا چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ کے اندر خاندانی نظام کی یہ درہمی و برہمی پیدا نہیں ہوئی، ناجائز بچوں کی یہ کثرت نہیں ہوئی، طلاقوں کی یہ بھرمار نہیں ہوئی، بچوں کے جرائم کا یہ زور نہیں ہوا، اولاد اپنے بوڑھے والدین کے لیے اس قدر بے درد نہیں ہوئی، اور والدین اپنی اولاد سے اس درجہ بے پروا نہیں ہوئے کہ بچوں سے بڑھ کر ان کو اپنے کُتّے زیادہ پیارے ہو جائیں۔ تعصب سے ذہن کو پاک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی دنیا کو دیکھ کر کوئی مفید سبق حاصل کیا جا سکتا۔

اس سلسلے میں ایک اور مثال بھی میں پیش کر سکتا ہوں۔ آج کی دنیا پے درپے لڑائیوں کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ دو عظیم اور خوفناک لڑائیاں ہو چکی ہیں اور ایک تیسری لڑائی کا ہر وقت خطرہ ہے۔ چاروں طرف یوں محسوس ہوتا ہے کہ بارود بچھی ہوئی ہے اور دنیا کو بھڑکا دینے کے لیے بس ایک چنگاری کافی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے موجودہ نظام میں چند بنیادی خرابیاں موجود ہیں جنہوں نے روئے زمین کو آتش فشاں بنا رکھا ہے۔ ان میں سے ایک خرابی یہ حد سے بڑھی ہوئی قوم پرستی ہے جس نے قوموں کو ایک دوسرے سے پھاڑا ہے اور ایک دوسرے کا حریف بنا دیا ہے۔ اور ایک دوسری خرابی وہ تنگ نظری اور تنگ دلی ہے جس کی وجہ سے فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے ساتھ کبھی فیاضی کا سلوک نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو کچلنے اور دبانے اور اس کی عزتِ نفس کو ختم کرنے اور مادی حیثیت سے اس کو بالکل برباد کر دینے اور اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ایک جنگ ختم ہوتے ہی دوسری جنگ کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ اہلِ مغرب کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے کہ کیا کوئی دوسرا معاشرہ ایسا ہے جس کے پاس کوئی ایسی ہدایت موجود ہو جس کی بدولت اس کے ہاں کبھی جنگ نے یہ شکل اختیار نہیں کی۔ بلاشبہ مسلمانوں کے اندر بھی اسلام کی پوری پیروی نہ کرنے کے باعث بارہا آپس کی لڑائیاں پیش آئی ہیں۔ غیر مسلموں سے بھی بارہا ان کا مقابلہ ہوا ہے۔ دنیا کے بہت سے ملک انہوں نے بھی فتح کیے ہیں لیکن اگر کوئی شخص انصاف کی نظر سے دیکھے تو اسے نظر آ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر کبھی نیشنلزم کا وہ اندھا جنون پیدا نہیں ہوا جو مغربی دنیا میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں نے کبھی مفتوحوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو اہلِ مغرب نے کیا ہے۔ اسپین کو کبھی مسلمانوں نے بھی فتح کیا تھا، اور پھر عیسائیوں نے

بھی اسے مسلمانوں سے چھینا۔ دونوں فتوحات کے نتائج ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔ فلسطین اور بیت المقدس کبھی مسلمانوں سے بھی چھینے گئے تھے، اور مسلمانوں نے بھی کبھی ان کو واپس لیا تھا۔ دونوں کا فرق آخر کس کو معلوم نہیں ہے؟ اس فرق کی وجہ تلاش کیجیے۔ کیا اس کی کوئی وجہ اس کے سوا بتائی جاسکتی ہے کہ اسلام نے اپنے پیرو انسانوں کو اس قدر وسیع القلب اس قدر فیاض، اور اس قدر غیر قوم پرست بنا دیا ہے جس کے باعث وہ فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے ساتھ کبھی وہ سلوک نہیں کرتے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں، اور ان کے اندر قومیت کا وہ جنون کبھی پیدا نہیں ہوتا جو اپنی قوم کے سوا انسان کو ہر دوسری قوم کا دشمن بنا دیتا ہے۔ اسلام کی اُن تعلیمات کو کھلے دل سے دیکھنا چاہیے جن کی بدولت مسلمانوں کو یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔ اگر ان کے اندر کوئی بھلائی پائی جاتی ہے، اگر ان کے اندر کوئی روشنی نظر آتی ہے تو آخر کیوں نہ اس سے رہنمائی حاصل کی جائے؟ انسان اپنا خود دشمن ہوگا اگر کہیں اسے دارو ئے شفا ملتی ہو تو وہ صرف اس لیے اس کو لینے سے انکار کر دے کہ یہ اس کے ہاں کی چیز نہیں ہے۔

آخر میں ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، اگرچہ میری قوتِ گویائی اب جواب دے رہی ہے۔ اس زمانے میں خوش قسمتی سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو مغربی تہذیب کے ایک بہت بڑے مرکز انگلستان میں آکر رہنے کا موقع ملا ہے۔ اس سے پہلے جب برطانیہ ایک سلطنت (EMPIRE) تھا اس وقت مسلمانوں کے ساتھ اہلِ برطانیہ کے تعلقات کی نوعیت کچھ اور تھی۔ اُس وقت اس کا امکان نہ تھا کہ ان کے درمیان کسی صحت مند بنیاد پر تہذیبی لین دین ہو سکے۔ لیکن اب سلطنت کا دور ختم ہوگیا ہے اور برطانیہ صرف ایک مملکت ہے۔ اب ہم اُسی طرح آزاد ہیں جس طرح خود اہلِ برطانیہ آزاد ہیں۔ اب ہمارا اور ان کا رابطہ دو آزاد قوموں کا سا رابطہ ہے جس میں نہ ایک فریق حقیر ہے اور نہ دوسرا فریق کبیر۔ یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر اس سے دونوں فریق فائدہ اٹھانا چاہیں تو اٹھا سکتے ہیں۔ ہم اہلِ برطانیہ کے علوم و فنون سے، ان کے سیاسی ادارات سے، ان کی آزادی صحافت سے، ان کی علمی تحقیقات سے اور ان کی تنظیمات سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں اور ہمیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح اہلِ برطانیہ بھی، اگر وہ خود بھی اُس رواداری سے کچھ کام لیں جس کا سبق وہ ہمیں دیا کرتے ہیں، ہم سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی سرزمین میں مسلمانوں کو اسلامی اصول کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیں تو بہت آسانی کے ساتھ انہیں یہ دیکھنے کا موقع مل سکتا ہے کہ آیا ہماری تہذیب میں کچھ اصول ایسے ہیں جن سے وہ فائدہ اٹھائیں۔

میں جب سے یہاں آیا ہوں میں نے اکثر یہ باتیں سنی ہیں کہ اہلِ برطانیہ میں۔ اور خصوصاً یہاں کے بعض لیڈروں کے دلوں میں یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ جو لوگ بھی اس ملک میں آتے ہیں وہ یہاں کی آبادی کے ساتھ ہم رنگ ہو جائیں اور اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کی خصوصیات کو چھوڑ کر انگریزی تہذیب و تمدن کی خصوصیات اختیار کریں۔ میں یہ عرض کروں گا کہ انہیں اپنے اس طرزِ فکر پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ یہاں انگریزوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اُن کے اندر کچھ اور انگریزوں کا اضافہ کرنے سے آخر کیا فائدہ ہوگا؟ اور مجھے یہ بھی اُمید نہیں کہ اگر یہ باہر سے آنے والے لوگ سو فی صدی بھی انگریز بننے کی کوشش کریں تو یہاں واقعی اُن کو انگریز مان لیا جائے گا۔ پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اہلِ برطانیہ کو دوسروں سے ایسا مطالبہ کرنے کی ضرورت ہی کیا پیش آئی ہے؟ کم از کم ہمارے ہاں پاکستان میں اور دوسرے مسلمان ملکوں میں تو انگریزوں، امریکیوں اور یورپین حضرات سے کبھی اس نوعیت کا مطالبہ نہیں کیا گیا کہ وہ اگر ہمارے ملک میں آ کر رہیں تو اپنا لباس ترک کریں، اپنے کھانے پینے کے طریقے چھوڑیں، اپنے طریقِ زندگی سے دست بردار ہوں اور ہمارے ساتھ ہم رنگ (INTEGRATE) ہو جائیں۔ حتیٰ کہ ہم نے تو کبھی ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ ان کی خواتین اپنی ٹانگیں ہی ڈھانک لیں۔ جب ہم نے ان کے ساتھ یہ رواداری برتی ہے تو وہ بھی ہمارے ساتھ کم از کم اتنی رواداری تو برتیں جو ہم ان کے ساتھ برت رہے ہیں۔ برطانیہ کی آبادی کثیر النسل (MULTI - RACIAL) تو بن ہی چکی ہے اگر وہ کثیر التہذیب (MULTI - CULTURAL) بھی ہو جائے تو اس میں آخر خطرے کی کیا بات ہے؟ مسلمان یہاں اپنی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کریں گے تو انشاء اللہ برطانیہ کے معاشرے کو مالا مال (ENRICH) ہی کریں گے، اور ان کی تہذیبی اقدار اور اطوار کو دیکھ کر اہلِ برطانیہ کو یہ دیکھنے کا موقع ملے گا کہ ان کے ہاں کیا چیزیں ایسی ہیں جن سے وہ آج تک اُن معاشرتی الجھنوں سے بچے رہے ہیں جن سے انگریزی معاشرہ اس وقت دوچار ہے۔ خوش قسمتی سے اس مجمع میں متعدد صاحبِ علم انگریز اصحاب بھی موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں نے خلوص دل کے ساتھ عرض کیا ہے اس پر وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور اگر میری باتوں کو معقول پائیں گے تو انہیں کھلے دل سے قبول کریں گے۔

آخر میں میں مجلسِ استقبالیہ کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے آپ حضرات سے ملنے کا قیمتی

موقع عطا فرمایا جس کی یاد انشاء اللہ میرے دل سے کبھی محو نہ ہوگی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

لمحۂ فکریّہ

(ہمیں کس وسیع محاذ کا سامنا ہے)

(نعیم صدیقی، ایڈیٹر سیارہ لاہور)

[اس مضمون (اور بعض دوسری تحریروں کو) حالیہ سفرِ حجاز سے قبل میں نے اس خیال سے لکھا تھا کہ شاید کچھ ایسے مواقع پیش آئیں کہ دل کی باتیں شدہ مدہ رُو عرض کی جاسکیں اور اپنا دردِ نہاں اپنے عرب بھائیوں کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ مگر بدقسمتی سے نہ تو ان چیزوں کا عربی یا انگریزی میں ترجمہ کرانے کا وقت ملا، اور نہ مختصر سے مصروف زمانۂ سفر میں ایسا کوئی موقع پیدا ہوا کہ اس مضمون یا کسی دوسری تحریر کو پیش کیا جائے۔ اب تلافی کی یہی صورت باقی ہے کہ اسے اردو میں ہی اشاعت میں لے آیا جائے اور پاکستان ہی سے اپنا پیغام برادرانِ عرب اور اخوانِ عالم اسلام تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ شاید خدا کے کچھ بندوں کے لیے یہ تحریر غور و فکر کی تحریک کا ذریعہ بن سکے۔]

ہم مسلمانانِ عالم جہاں کہیں ہیں، اپنی کثیر تعداد اور آزاد حکومتوں کے باوجود زخم رسیدہ ہیں اور لاینحل قضیوں سے دوچار ہیں۔ فلسطین پر جو گزری اور مصر اور اردن کو جو کچھ بھگتنا پڑا، اسی کے ساتھ کشمیر اور بھارت کے مسلمانوں کے حالِ زبوں کا تصور کیجیے کہ ان پر ہندو غنڈوں کے ہجوم جب چاہتے ہیں حملہ آور ہوتے ہیں، گھروں کو جلاتے ہیں، نوجوانوں کو ذبح کرتے ہیں، عورتوں کی عصمتیں تاراج کرتے ہیں۔ اور پولیس اور فوج اور عدالتیں اور اسمبلیاں بے بس ثابت ہوتی ہیں۔ پھر اریٹیریا، نائیجیریا اور فلپائن کے مسلمانوں کے ابتلا کا تصور کیجیے۔ پھر یاد کیجیے کہ قبرص میں ہمارے ترک بھائی مصائب کی کیسی بھٹیوں میں تپائے جاتے رہے ہیں۔

ایک مربوط محاذ

ہمارے یہ تمام قضیے بظاہر جُدا جُدا دکھائی دیتے ہیں، اور ہر جگہ زیادتی کرنے والا ایک نیا فریق ہمارے سامنے آتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ سارے قضیے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اور ہمارے جسمِ ملت کے سارے زخم ایک ہی پروگرام کے تحت اس طاقت کے لگائے ہوئے ہیں جسے الکفر ملۃ واحدۃ کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ سارے کرشمے مختلف عالمی طاقتوں کی مسلم دشمن اسکیموں کا نتیجہ ہیں اور ان ساری اسکیموں کی کڑیاں مل کر ایک بڑے منصوبے کے تحت جمع ہو جاتی ہیں۔ اس مسلم دشمن منصوبے میں صہیونیت، مغربی سرمایہ دار قومیں، عیسائی تعصب، تنگ نظر ہندو کی مخالفتِ اسلام اور کمیونزم کے ملحدانہ رجحانات سب مِل جُل کر ایک ہو جاتے ہیں

ذرا سوچیے کہ یہ کتنی عجیب صورتِ حالات ہے کہ بھارت مسکرا مسکرا کر اپنی مسلم اقلیت کے خون سے رنگے ہوئے ہاتھ عربوں کی طرف مصافحہ کے لیے بڑھاتا ہے اور ان کے اندر اپنی منڈیاں تلاش کرتا ہے، مصر سے کھلے کھلے سفارتی اور تجارتی روابط بھی استوار کرتا ہے[1]، اور دوسری طرف اسرائیل سے گہری دوستی کے تحت سازباز بھی کرتا رہتا ہے اور لین دین بھی۔ روس عربوں کے سر پر بھی ہاتھ دھرتا ہے اور ادھر اسرائیل کے قیام کی حمایت سے کر اسے مستقبل کے لیے تحفظِ وجود کی ضمانت دینے میں پیش پیش ہے۔ وہ امریکہ اور مغربی قوموں کے

[1] مصر میں حال ہی میں گاندھی جی کی برسی بھی منائی جا رہی ہے اور ایک سڑک کا نام "گاندھی روڈ" رکھا جا رہا ہے۔

سامراجی مفادات اور ان کے اڈوں کی مخالفت بھی کرتا ہے۔ اور دوسری طرف خود اپنے سامراجی مفاد کے جال مشرقِ وُسطیٰ میں پھیلا رہا ہے اور اپنے لیے اڈے فراہم کر رہا ہے۔ اسی طرح امریکہ ایک طرف عرب ریاستوں سے کاروباری فائدہ بھی اٹھاتا ہے، انہیں تھوڑا بہت دفاعی سامان دینے کی نوازش بھی کرتا ہے۔ مصر کو اقتصادی تعاون بھی بہم پہنچاتا ہے، اور یہودیوں کا سرپرست اور معاون نمبر ایک بھی ہے۔ شاہ ہیل سلاسی افریقی اتحاد کے لیے کام کرتا ہے، صدر ناصر اور اسرائیل سے بیک وقت دوستانہ رابطے نبھاتا ہے اور اریٹریا کے مسلمانوں کے لیے عرصۂ حیات بھی تنگ کیے ہوئے ہے۔ ان اجمالی اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صیہونیت اور سرمایہ داری میں، صیہونیت اور کمیونزم میں، کمیونزم اور سرمایہ داری میں، یہود اور ہنود میں، میکاریوس اور اسرائیل میں، میکاریوس اور ہیل سلاسی میں جو پُراسرار رابطے ہیں وہ مسلم دشمن عناصر کی سازشی ڈوریوں کو ایک دوسرے سے گرہ دے کر ایک غیر محسوس متحدہ محاذ بنائے ہوئے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کا اسٹیج

اسی پُراسرار مسلم دشمن محاذ کی ذہنیت اقوامِ متحدہ کے اسٹیج پر بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہ ادارہ چند عالمی طاقتوں کے مفاد کی ایک کاروباری فرم بن کر رہ گیا ہے۔ اس تنظیم کی عمر تقریباً چوتھائی صدی ہے۔ مسلمان ممالک کے بارے میں اس لمبے دور کی پالیسیوں کا خلاصہ دو نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ جب کبھی کسی مظلوم مسلمان ملک کی طرف سے اپنا چھنا ہوا حق خود اقوامِ متحدہ کے اصولوں کے مطابق طلب کرنے کی آواز اٹھائی گئی ہے، تو اوّل تو اسے سازشی طاقتوں کے اکثریتی دباؤ سے دبا دیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی ریزولیوشن پاس کرنا لازم ہو گیا، یا کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑا تو بلا استثناء کسی معاملے میں وہ نہ تو مسلّمہ اصولوں کے معیار پر پورا اُترا اور نہ مسلمانوں کے جائز مفاد سے مطابقت پا سکا۔ بالعموم ایسے تمام فیصلے مسلمانوں کے لیے ضرر اور پیچیدگی کا پیغام لے کے آئے جن کے نتائج وہ مختلف خطوں میں سالہا سال سے بھگت رہے ہیں۔ دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کی لمبی تاریخ میں اگر کوئی ریزولیوشن یا فیصلہ ایسا پاس کیا گیا جو مسلمانوں کے لیے مفید ہونے کا امکان رکھتا ہو تو اسے جامۂ عمل پہنانے سے گریز کرتے کرتے، وقت گزار کر سرد خانے میں دفن کر دیا گیا۔ اور اس سنہری پالیسی کا سہرا ان طاقتوں کے سر سجتا ہے جن میں سے ایک نے اقوامِ متحدہ سے پروانہ حاصل کر کے کوریا اور ویت نام

میں قوم کے جان و مال کی بازی بلاتا خیر لگا دی، اور دوسری نے چیکوسلاواکیہ میں آناً فاناً فوجی تاخت کردی۔ اور اس بات کی ضرورت کبھی نہیں سمجھی کہ عالمی اور بین الاقوامی مسائل کا پُرامن فیصلہ کرنے کے لیے جس مقدس ادارے کی محرومی ناسیس کی تھی، پہلے معاملہ اس کے سامنے رکھا جائے۔

اسرائیلی ریاست سے لے کر اقوام متحدہ تک جن طاقتوں کا یہ طرزِ عمل رہا ہے، آج وقت ہے کہ ان کے عالمگیر مسلم دشمن منصوبے کو پوری طرح سمجھ لیا جائے۔ مسلمانوں کو کمزور بنا کر انہیں زیرِ اثر رکھنے، اور ان کو ایک متحدہ حربی قوت بننے سے روکنے کے لیے حسبِ ذیل تدابیر عمل میں لائی جا رہی ہیں، جو مل کر اس وسیع منصوبے کی تکمیل کرتی ہیں جس کا سامنا سارا عالمِ اسلام کر رہا ہے:-

علمی و فکری محاذ ان طاقتوں کا ایک محاذ علمی و فکری محاذ ہے یعنی مختلف علوم و فنون پر ایسا لٹریچر، کتب اور رسائل کی شکل میں مسلمان ملکوں میں سیلاب کی طرح آ رہا ہے جس میں تمام مسائل کو ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اسی رنگ کا مواد نصابی کتب یا امدادی نصابی کتب میں بھی بھرا ہوا ملے گا۔ یہ علمی و فکری حملہ ایسے تابڑ توڑ اور مرعوب کن انداز سے جاری ہے کہ مسلمانوں کے اندر بیرونی علوم و افکار کے خلاف جذبۂ تنقید سر نہیں اٹھا سکتا، بلکہ اُلٹا وہ نہ صرف اندھی تقلید کی راہ اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ غیر اسلامی اور خلافِ اسلام علوم و افکار کے وکیل اور مبلغ بن جاتے ہیں۔

دوسری طرف مستشرقین کا ایک لشکر کا لشکر اسلامی موضوعات —— قرآن، وحی، رسالت، سیرت، تاریخ، سیاست، خلافتِ راشدہ، اقتصادی نظام، اور عمرانیات —— پر ایسی کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر تیار کر کے ہمارے ہاتھوں تک پہنچا رہا ہے جن کو پڑھ کر اسلام نا آشنا یا محدود مطالعہ رکھنے والے مسلمان لیڈر اور افرادِ معلم اور طلبہ اور اخبار نویس اور ادیب اسلام کے متعلق اس ایمان و اعتماد سے محروم ہو جائیں جو ان کا سرمایۂ حیات ہے۔

نظریاتی محاذ ایک محاذ نظریاتی محاذ ہے یعنی سرمایہ دار اور کمیونسٹ ممالک اپنے اپنے ہم خیال (یا قریب الخیال) گروہوں کو بہتر ڈپلومیٹک تعلقات کے سائے میں اپنی سرپرستی مہیا کرتے ہیں، اور ان کی ہر طرح پشت پناہی کر کے انہیں مضبوط بناتے ہیں۔ سامراجی قوتوں کے ذہنی مریدوں کے یہ حلقے اپنے ممدوحین کے لیے عوام میں میدان ہموار کرتے ہیں، اور قدرتی طور پر ان مساعی کی وجہ سے نظریۂ اسلامی اور اس کے علمبرداروں کی قوت کو نقصان پہنچتا ہے

محاذِ نفوذ یہ عالمی طاقتیں مسلمان معاشروں میں سے ایسے علمی اداروں، اشاعتی تنظیموں اور مذہبی فرقوں کو چھانٹ چھانٹ کر ان کی سرپرستی و حمایت کرتی ہیں اور ان کو ترقی پسند اور علمبردارانِ جدت قرار دے کر ان کو اہمیت کا مقام دلواتی ہیں جو مسلمانوں کے اساسی معتقدات کو متزلزل کرنے کے لیے مختلف فکری، اعتقادی، کلامی اور ثقافتی فتنوں کو نشوونما دیتے ہوں۔

ان عالمی طاقتوں کی ایک کوشش ہر مسلمان ملک میں یہ ہوتی ہے کہ وہ نظامِ تعلیم میں دخیل ہو کر اسے اپنے ڈھب پر رکھنے کی کوشش کریں۔ اس کام کے لیے کبھی ملکی سطح پر اور کبھی عالمی سطح پر تعلیمی کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں، کہیں ماہر مشیر تعلیمی پالیسی بنانے والے اداروں کے اندر سے اثر ڈالتے ہیں، کہیں قومی تعلیم گاہوں کے متوازی بالکل دوسرے رنگ کی شاندار درسگاہیں کھولی جاتی ہیں۔ اس تعلیمی پروگرام کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں مخلوط تعلیم کو رائج کیا جائے اور اس تجربے سے کنارہ کشی کو ان کی نگاہوں میں خوفناک قسم کی پسماندگی کی علامت بنا دیا جائے۔ اور اس مخلوط تعلیم کے پورے ثمرات حاصل کرنے کے لیے تعلیمی اداروں میں مخلوط غسل کے لیے تالاب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

پروپگنڈے کا محاذ ایک بڑا محاذ پروپگنڈے کا محاذ ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ روزمرہ کی خبروں میں پروپگنڈے کے حربے مسلمانوں کے خلاف بکثرت استعمال کیے جاتے ہیں، بلکہ اس محاذ کا سب سے بڑا پارٹ یہ ہے (جس کے لیے اخبارات و جرائد کے ساتھ ساتھ کتابوں کو بھی ذریعہ بنایا جاتا ہے) کہ مسلمان ممالک کی ان تمام تحریکوں، جماعتوں اور شخصیتوں کو کوتاہ اندیش، ترقی دشمن اور قدامت پرست بنا کر پیش کیا جائے جو اسلامی تہذیب کے احیاء اور اسلامی اصول و اقدار کے نشوونما کے لیے کام کر رہے ہوں۔ دوسرے ذرائع کے علاوہ چو طرفہ اُمڈنے والے پروپگنڈے کے دباؤ سے متعلقہ حکمران طبقوں کو آہستہ آہستہ تھپکا دیا جائے کہ وہ ان کو نشانۂ تشدد بنائیں۔ اور جب کوئی حکومت ایسا کارنامہ انجام دے دے تو عالمی پروپگنڈے کے ایوان میں مرحبا و آحسنت کی صدائیں گونج اٹھیں۔ حالانکہ فی الاصل یہ بیوقوف بنا کر کسی قوم کے اپنے ہاتھوں اس کی قوت تباہ کرانے کا کھیل ہوتا ہے، اور داد دینے والے زیرِ لب اس بیوقوفی پر ہنسی اڑاتے ہیں۔ پچھلی نصف صدی میں یہ مکارانہ ہتھکنڈہ ہمارے خلاف متعدد بار استعمال کیا جا چکا ہے۔ اور اس حربے سے کام لینے میں سرمایہ دار، کمیونسٹ اور صیہونی سبھی بالکل یک رنگ

ثابت ہوتے ہیں۔

پروپیگنڈے اور دیگر سازشی تدابیر، کا ایک استعمال یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ کسی بھی مسلمان ملک کی جو حکومت و قیادت یا جو شخصیت دوسروں کے لیے اچھا آلۂ کار نہ بن سکی وہ آہستہ آہستہ اس کے خلاف فضا تیار کر کے اسے برطرف کرا دیا گیا، اور اس کی جگہ اپنی پسند کی پارٹی یا شخصیت کو تخت پر بٹھانے کے لیے حالات سازگار بنا دیئے گئے۔ اور جو لیڈر یا حکمران مفید ثابت ہوا وہ ملک و قوم کے لیے چاہے کیسا ہی وجہِ عذاب کیوں نہ ثابت ہو، اسے توسنِ اقتدار کی زین پر قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ سہارا دیا گیا۔

امداد کا محاذ "امداد" مختلف شکلوں میں، خود ایک بڑا محاذ ہے جس کے بل پر مسلم معاشروں کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں نفوذ حاصل کیا جاتا ہے، حسبِ منشا نئے نئے محکمے کھڑے کرائے جاتے ہیں، لوگوں کے لیے مفادات کی راہیں نکالی جاتی ہیں۔ وظائف دیئے جاتے ہیں، کاروباری معاملات کے راستے بنائے جاتے ہیں، منڈیوں پر تسلط حاصل کیا جاتا ہے، مہنگے داموں اپنی مصنوعات بیچی جاتی ہیں، اپنے آدمیوں کے لیے بھاری تنخواہوں پر کام نکلوائے جاتے ہیں، ضمیر فروشوں کو خریدا جاتا ہے، معلومات جمع کی جاتی ہیں، "بظاہر آزاد" ملکوں کی داخلی سیاسیات اور خارجہ تعلقات پر اثر ڈالا جاتا ہے۔ نیز امداد دینے کے محسنانہ اثر سے ایسے پُراسرار غیر ملکی اداروں کو تحفظ دلوایا جاتا ہے جن کی سرگرمیاں مسلمانوں کے حق میں سخت مضر ہوتی ہیں۔

لسانی محاذ ایک اہم بیرونی کوششوں کی طرف سے یہ جاری رہتی ہے کہ مسلمان نہ صرف عربی زبان، بلکہ کسی بھی ملک میں اپنی قومی زبان سے دور ہوتے جائیں، یا کم سے کم قومی زبان کمزور اور ثانوی حیثیت میں رہے، عملاً تعلیمی، تجارتی، علمی، مجلسی اور دفتری لحاظ سے کسی بیرونی زبان کو تفوق حاصل ہو۔

قومی زبان کو اس کے ماضی کے علمی و ادبی ذخیرے سے محروم کر کے تہی مایہ بنانے کے لیے مختلف حیلوں سے یہ تحریک بھی چلائی جاتی ہے کہ رسم الخط تبدیل کرا دیا جائے۔

"ترقی" کا محاذ مسلم دشمن منصوبے کی ایک اہم اور بظاہر دلفریب اسکیم سائنسی اور اقتصادی ترقی کی اسکیم ہے۔ بڑی طاقتیں اپنے ماہرین کی رہنمائی، مالی امداد، مشینوں کی سپلائی، تعلیمی توسیع اور تعلیم گاہوں اور لائبریریوں کے لیے فنی کتابوں کی فراہمی کی صورت میں مختلف مسلمان ملکوں پر بظاہر بہت بڑا احسان کرتی ہیں جس کے نتیجے میں عملاً

سائنسی اور اقتصادی ترقی رونما بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جس نقشۂ کار کے تحت کام کیا جاتا ہے اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ "ترقی" کا خالص مادّی دنیوی اور غیر خدا پرستانہ تصور راسخ کر دیا جائے۔ روحانی قدریں اور اخلاقی روایات اس ترقی کے ریلے میں بہہ جائیں۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خود بہت سے مسلمانانِ کرام دل سے اس امر کے قائل ہو جاتے ہیں کہ اسلامی معتقدات، روحانی تقاضے، اخلاقی قدریں اور ملّی روایات ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں، اور وہ علی الاعلان یہ ادّعا کرنے لگتے ہیں کہ اسلامی اصول و احکام ایک خاص دَور کے لیے تھے، اور اب یا تو ان کو تبدیل کر کے اسلام کو نیا مفہوم دینا ہوگا، یا پھر اسے ترک کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔

پھر اس "مادّی ترقی" کا جادو مسلمانوں کو اس کا بھی قائل بنا دیتا ہے کہ اس ترقی کے ساتھ جو جو کچھ آلائشیں اور مفاسد آرہے ہیں وہ بھی اس کا لازمہ ہیں اور ان کا خیر مقدم کرنا اور اسلامی معاشروں میں ان کی جگہ بنانا بھی ضروری ہے۔

مشینی دَور کے اس مادّی تصورِ ترقی کے لائے ہوئے سیلابِ دولت، مظاہرِ ایجادات، معیارِ زندگی کی دوڑ، خواہشوں کے وفور، قوتوں اور اوقات کی دنیوی سرگرمیوں میں کھپت، تفریحات و تعیشات کی لگن اور دوسری طرف محروم طبقوں کی پریشاں حالی کے سامنے اسلام کا تصورِ ترقی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔

اب گویا ہم مسلمانوں کے سامنے "ترقی" اور "اسلام" دونوں کے راستے اقوامِ غالب نے بالکل الگ الگ کر دیئے ہیں کہ ایک پر چلو تو دوسرا چھوڑنا پڑے۔ اور ترقی چونکہ زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے، لہٰذا چاہے وہ کیسے بھی غلط تصور کے تحت نافذ کی جائے، چار و ناچار اسے اختیار کرنا ہوا۔ اور اسی جدید تصور کے ساتھ اب ترقی کی گاڑی زوروں سے اسلامی معاشروں میں چل رہی ہے۔ اور اسلام اس چلتی گاڑی کو جس پر مسلمان سوار ہیں، اور الحاد جس کا ڈرائیور ہے، خاموشی سے دیکھ رہا ہے، اور سوچ رہا ہے کہ یہ بالآخر کس اسٹیشن پر جا کر رُکے گی۔

ترقی اور ترقی کے نعرے کے ساتھ، مخالفِ اسلام یا اسلام سے آزاد تصورِ ترقی کو مسلمانوں میں رائج کر دینا مخالفِ اسلام طاقتوں کی ایک نمایاں کامیابی ہے۔ شاید سادہ لوح مسلمان اغیار کی اس کامیابی کو بڑی دیر میں جا کر سمجھیں گے۔

مسلمان ملکوں میں روپیہ اور لٹریچر کی طاقت استعمال کر کے اُن کی رفتارِ اضافہ کو یہ ہُوّا دکھا کر روکنا کہ بڑھتی ہوئی آبادی ترقی میں رکاوٹ ہے، اور اس طرح انہیں نشوو ارتقاء کے مثبت راستے سے ہٹا کر منفی راستے پر لگانا اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کی طاقت مستقبل کے لیے جو خطرات دنیا کی قیادت کرنے والی بڑی اقوام کے لیے رکھتی ہے اس کی روک تھام کرنا بھی ہمارے مہربانوں کے پروگرام میں شامل ہے۔ مغرب کی اس تحریک نے ہمارے بنیادی تصورات اور اقدار پر کاری ضرب لگائی ہے یعنی اب ہر خاندان کے سامنے دو چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا مسئلہ ہے یعنی زیادہ بچے یا ان کے بالمقابل ریڈیو، کیمرے، ٹیلی وژن، فیشنی لباس، میک اپ کے سامان، خوبصورت فرنیچر، نفیس کراکری، فلمیں، عُریاں تصاویر اور تعیش آموز میگزین وغیرہ — دونوں میں سے کیا چاہتے ہو؟ اور مستقبل کے پردۂ غیب میں مستور اولادوں کو لوگ چاروں طرف دکھائی دینے والی ان خوشنما چیزوں پر قربان کر رہے ہیں۔ یعنی انسانیت کی قیمت مادّی سامانوں سے گھٹ گئی ہے۔

اس طرح اقتصادی لحاظ سے برتری رکھنے والی بڑی قوموں نے دوسرے مقاصد کے ساتھ یہ فائدہ بھی پیدا کر لیا ہے کہ اپنی مصنوعاتِ آسائش و تفریح (اور ضبطِ تولید کے لوازم) کی منڈیوں میں غیر محسوس طریق سے توسیع کر لی ہے۔ اور توسیع کا یہ سلسلہ جاری ہے یعنی وہ محنت اور آمدنی جو ہم لوگ اپنی اولادوں پر خرچ کرتے اور عیالداری میں سادگی کی راہ اختیار کرنے کی وجہ سے زیادہ تر ملکی اور گھریلو پیداواروں اور مصنوعات پر اکتفا کرنے، اب ہم ضبطِ تولید کے کشتگان کا حصہ دولت اس حکمتِ فاسدہ کے معلّمین کے قدموں پر نچھاور کرتے ہیں۔

اس قسم کی تحریکات سے ایک بُرا فائدہ اغیار یہ بھی اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہ ضبطِ تولید کے سائنسی طریقوں کو رائج کر کے بدکاری کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ (اندیشۂ باروری) کو دُور کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد مخلوط تعلیم اور "دوش بدوش" قسم کی سماجی زندگی جو گُل کھلائے گی (اور جس کا تجربہ یورپ میں ہو چکا ہے) اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ جنسی بحران کا راستہ ہے، اور جس معاشرے میں جنسی بحران پھیل جائے، نہ صرف اسلامی حکمت کے رُو سے، بلکہ تاریخ کے عمومی تجربات کی روشنی میں وہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے، اور وہ زندگی کے بڑے بڑے معرکوں میں اپنے حریفوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

عصبیت انگیزی کا محاذ | مذکورہ مسلم دشمن منصوبے میں ایک پروگرام یہ بھی شامل چلا آ رہا ہے کہ مسلمانوں کے تصورِ

وحدتِ ملت کو تباہ کیا جائے اور ہر ملک میں جداگانہ تصورِ قومیت اُبھارا جائے جس کی بنیاد میں دوسرے مسلمان ملکوں اور نسلوں سے کسی نہ کسی نوع کی منافرت شامل ہو۔ عربوں، ترکوں، ایرانیوں، افغانوں سبھی میں الگ الگ قومی عصبیت ابھاری گئی اور ان میں نزاعات کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر سامراجی پالیسی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایک ملک کے اندر عصبیتیں اُبھار کر اس کی چھوٹی سی وحدت کو بھی پارہ پارہ کر دینا چاہتی ہے۔ خود عربوں کو چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تقسیم کیا گیا، اور پھر ہر مملکت کے اندر مختلف عناصر میں تصادم کے محرکات پیدا کیے گئے۔ چنانچہ متعدد عرب ممالک داخلی طور پر فوجی انقلابی اور خونی تصادموں کے چکّر میں مبتلا ہیں۔

پُراسرار اداروں کا محاذ حال ہی میں صہیونیت کے عالمگیر سازشی جالوں کے متعلق جو انکشافات منظرِ عام پر آئے ہیں، نیز فری میسنری تحریک اور ان کے لاجوں کی خفیہ کارروائیوں کے بارے میں جو انکشافات دلائل و شواہد کے ساتھ کیے گئے ہیں، وہ مسلمانوں کے لیے ایک پیچیدہ صورتِ حالات کا نقشہ سامنے لاتے ہیں۔ امریکی سی، آئی۔ اے کے طریقِ کار کی تفاصیل بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اور اب لائنز کلب اور روٹری کلب کی تنظیموں میں بھی ایک پُراسرار پہلو محسوس کیا جانے لگا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمان ممالک میں غیر ملکی مشن اور کانونٹ اسکول اور دوسرے سماجی ادارے مذہبی اور ثقافتی لحاظ سے خطرناک پارٹ ادا کر رہے ہیں۔

ثقافتی محاذ وسیع مسلم دشمن منصوبے کی بہت بڑی اسکیم جسے ہم آخر میں لے رہے ہیں، مسلمانوں کو ثقافتی لحاظ سے شکست دینا ہے۔ اس کے لیے مے و قمار، اور رقص و سرود اور جنسیت زدہ فنونِ لطیفہ کو فروغ دینے کے لیے مسلمان ملکوں میں سعیِ مسلسل سے کام لیا جا رہا ہے۔ وہ خود آتے ہیں، ثقافتی مظاہرے کرتے ہیں، اور یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ یہ چیزیں لازمۂ ترقی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی، اور ان سے ترقی کا سرٹیفکیٹ لینے اور تحسین حاصل کرنے کے لیے یا کم از کم ان کی طرف سے قدامت و رجعت کے طعنوں اور گالیوں سے بچنے کے لیے[1] مسلمان ملکوں میں بھی مغربی ثقافت کے ادارے اور سوسائٹیاں قائم ہوتی ہیں۔ مخلوط تقاریب منعقد ہوتی ہیں، مینا بازار لگتے ہیں، فیشن پریڈ ہوتی ہے۔ لباسوں اور بہروپوں کے زنانہ مقابلے ہوتے ہیں، ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے درمیان کرکٹ اور ہاکی میچ ہوتے ہیں، موسیقی کے جشن اور مقابلے کرائے جاتے ہیں، حد یہ کہ آہستہ آہستہ مقابلۂ حسن کا سلسلہ بھی کہیں کہیں شروع ہو رہا ہے۔ ماڈرن عورتوں نے

---

[1] کیونکہ مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔

بازو، ٹانگیں، آدھا سینہ اور پیٹ حدودِ ستر سے خارج قرار دے لیے ہیں۔ تنگ لباس اور نیم عُریاں جسموں کی نمائش کھلے بندوں شاہراہوں اور پارکوں میں ہو رہی ہے، بالوں کے طرح طرح کے فیشن رواج پا رہے ہیں۔ ساڑھن شہروں کے علاوہ بیوٹی کلینک کھل رہے ہیں، اسکولوں میں چھوٹی چھوٹی بچیوں تک سے ناچ کرائے جانے لگے ہیں، بڑے گھروں میں ان "فنونِ مبارکہ" کی تربیت و نمائش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ نئی ثقافت اپنے بھرپور مظاہرے کے لیے مغربی طرز کے ہوٹل اور کلب وجود میں لا رہی ہے، جہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جسے اقوام غالب پسند کرتی ہیں اور جس سے انسانیت کو نجات دلانے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی پاکیزہ اور محکم تعلیمات لے کے آئے تھے۔ روپیہ کمانے کے لیے اب مسلمان ملکوں میں سیاحی کی "صنعت" عام ہو رہی ہے اور اس صنعت کو کامیاب بنانے کے لیے وہ سب کچھ فراہم کرنا پڑتا ہے جس کی مانگ غیر ملکوں کے تفریح پسند گاہکوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ یعنی مئے ارغوان بھی، اور معشوقانِ جوان بھی۔

"ثقافت کا یہ حملہ جس کی پشت پناہی پہلے صرف دلفریب میگزینوں اور لٹریچر اور مصوّر اشتہارات سے کی جاتی تھی، اس کے فروغ کے لیے اب سینما کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن جیسے مؤثر آلات آ گئے ہیں جو براہِ راست ایک ایک گھر اور ایک ایک فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان نئے ذرائع نے اب اُن عفیف مسلم خواتین کو بھی زد میں لے لیا ہے جو خدا اور رسول کے دین سے کٹنا نہیں چاہتیں، اور جنہوں نے ساری زندگیاں حجاب و عفت کے ساتھ گزاری ہیں۔ پھر معصوم بچوں کے ذہنوں پر یہ آلات ابتدا ہی سے اپنا سحر طاری کر دیتے ہیں۔ اور ان آلات کے واسطے سے جس ثقافت کی تبلیغ ہوتی ہے وہ مخالفِ اسلام مادّی ثقافت ہے، اور اس کے زہریلے پن میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ آپ تھوڑا سا اسلامی پروگرام بھی اس میں شامل کر دیں۔

مادّی تہذیب کی پیدا کردہ یہ تحریک ثقافت اسلام کے خلاف ایک خوشنما اور مسحور کُن بغاوت ہے۔ یہ انسان کو اخلاقی علو کے اس زینے پر قدم ہی نہیں رکھنے دیتی جو اسلام کے بلند تر روحانی و اخلاقی مقاصد کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ اپنے زیرِ اثر افراد اور معاشروں کو سفلگی کے گڑھوں میں محصور کر دیتی ہے[1]۔

---

[1] اس معاملے میں ہمارے وہ مسلمان بھائی براہِ راست خطرے کی زد میں ہیں جو غیر اسلامی معاشروں میں روزگار کے لیے مستقل قیام پر مجبور ہیں۔ ان کو ایک مخالفانہ تہذیبی ماحول چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ اگر ذرا چوک گئے تو

جارحیتوں کا محاذ | بائبل آخری اور وقتی محاذ کھلی جارحیت کا محاذ ہے جسے کوئی ایک ملک مسلمانوں کے کسی خطے کے خلاف عمل میں لاتا ہے، اور بڑی طاقتیں خفیہ طور پر بھی اور کبھی علانیہ بھی اس کی پشت پناہی کرتی ہیں۔

اس وسیع محاذ کو سامنے رکھ کے سوچیے کہ فلسطین اور کشمیر اور قبرص اور اریٹریا کے مسائل کا حل کیا ہے؛ ہمیں کن تیاریوں کی ضرورت ہے؟ ہماری کن قوتوں میں کمی ہے؟ ہمارے ہاں کن کن جوابی محاذوں کی ضرورت ہے؟ علم و فکر، پروپیگنڈے، نظریاتی کشمکش، اور ثقافتی یلغار اور سفارتی سازشوں کے میدانوں میں ہمیں کیا پوزیشن اختیار کرنی ہے اور کس محاذ کا مقابلہ کن طریقوں سے کرنا ہے۔

ہمیں سب سے پہلے پیچیدہ حالات کے فہم و شعور اور ان کے مطالعہ و تجزیہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں اتحاد کی ضرورت ہے ہمیں تقسیمِ کار کی ضرورت ہے۔ مختصر اور لمبی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ کو بدلنے اور نئی صلاحیتوں سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اسلام کی ضرورت ہے۔ اسلام ہی ہماری تلوار ——— اسلام ہی ہماری ڈھال، اسلام ہی ہماری پناہ گاہ، اسلام ہی ہمارا نصب العین، اسلام ہی ہمارا رشتۂ یگانگت اور اسلام ہی ہمارے لیے دائمی حرکت ہے۔

اسلام سے ہٹ کر سارے تجربے کیے جا چکے اور آج ہم بدترین نتائج سے دوچار ہیں پس اب اگر کوئی راستہ باقی ہے تو وہ صرف اتباعِ اسلام کا راستہ ہے۔

۵۔ ایسی خصوصی تنظیمیں کے ذریعے جو ثقافتی، اخلاقی، دینی اور سماجی لحاظ سے اپنے بعض اصول و حدود کو متعین کر کے ان کی عملی سرپرستی کریں نیز اپنے بچوں کے قرآن، دینی معلومات اور اسلامی تاریخ کی تعلیم کے لیے خصوصی تدابیر اختیار کریں اور اپنے مخصوص اطوار، شعائر اور تقاریب کو ان کے اصل رنگ پر قائم رکھنے کے لیے متحدہ سعی کریں۔

حُجّیتِ حدیث

از: عبدالحمید صدیقی

قرآن مجید اگر شریعتِ اسلامی کی رُوح ہے تو حدیث اس کا جسم۔ حدیث ہی سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا وہ نقشہ اُبھر کر سامنے آتا ہے جس کا اسلام علمبردار ہے۔ اگر قرآن مجید کے ساتھ حدیث محفوظ نہ ہوتی تو ہمارے لیے منشائے ربانی کے عملی مضمرات جاننا بالکل ناممکن تھا۔

باری تعالیٰ اپنے پیغام کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو جو ذریعہ بناتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ان مقدس حضرات کی مقدس زندگیوں میں پیغامِ ربانی کا عکس اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور اس حقیقت کو جان سکیں کہ منشائے الٰہی کو پُورا کرنے کی عملی صورت کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ (التوبہ ۳۳)

اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پورے جنسِ دین پر غالب کر دے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہدایتِ الٰہی کا سرچشمہ باری تعالیٰ کا رسول ہے اور یہی وہ سب سے زیادہ مستند اور قابلِ اعتماد ذریعہ ہے جس سے ہمیں صحیح علم اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ مریم میں مذکور ہے:

یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۔ (مریم ۴۳)

ابا جان! درحقیقت میرے پاس وہ حقیقی علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میری پیروی کریں میں آپ کو سیدھی راہ پر چلاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارشاد اس حقیقت کی واضح ترجمانی کرتا ہے کہ ہدایتِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ پیغمبر ہی کی ذات ہے۔ اسی کی وساطت سے تعلیماتِ الٰہی ہم تک پہنچتی ہیں اور پھر اس کی حیاتِ طیبہ ان تعلیمات کا مظہر بنتی ہے اور اُس کی پیروی سے ہی منشائے الٰہی کو پُورا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بڑے واضح الفاظ

میں یہ بتایا گیا ہے کہ محض "العلم" کا حاصل ہو جانا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی پیروی کر کے اس علمِ ربانی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ حقیقت کو پانے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی صرف یہی ایک صورت ہے رسول کو چونکہ باری تعالیٰ اپنے منشا کا ترجمان بناتا ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت درحقیقت خداوند قدوس کی اطاعت ہی ہوتی ہے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء۔۸۰) جس نے رسوؐل کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر اس امر کی تصریح ہے کہ نبی کی پیروی ہی واحد ذریعہ نجات ہے۔ مثلاً سورۂ نور میں یہ ارشاد ہے وان تطیعوا تھتدوا (یعنی اگر تم رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے) پھر سورۂ حشر میں مذکور ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ رسوؐل جو تم کو دیں اُس کو لے لو اور جس سے منع کریں اُس سے رُک جاؤ اور اس بارے میں اللہ کی پکڑ سے ڈرو۔ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جہاں ایک طرف رسوؐل کی پیروی ذریعہ نجات ہے تو دوسری طرف رسول کی نافرمانی سے انسان ضلالت و گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا۔ (الاحزاب۔۳۶) اور جو کوئی بھی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ بڑی کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

اسی سلسلے میں قرآن مجید نے اس امر کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اسلام میں اللہ کی محبت کا مطلب وہ نہیں جو کہ دنیا کی بعض مذہب پرست قوموں میں پایا جاتا ہے کہ انسان کسی مافوق الفطرت ہستی کی محبت میں گم ہو کر اپنی انسانی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کر دے۔ اسلام نے اللہ کی محبت کے طلبگار کو یہ بتایا ہے کہ وہ ذاتِ مطلق اگر اُسے فی الحقیقت محبوب ہے اور وہ اُس کی رضا جوئی کے لیے دل سے خواہشمند ہے تو اُس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اس بزرگ و برتر ذات کی صدق دل کے ساتھ اطاعت و پیروی کرے جو اُس کی طرف سے انسانوں کو خدا کی محبت کی راہ دکھانے اور پھر خود اس راہ پر چل کر اس کی عملی صورت سمجھانے

کے لیے معبوث کیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آلِ عمران۔ ۳۱)

کہیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی خود پوری طرح نگرانی کر کے اس انداز پر اُسے ڈھالا ہے کہ وہ ایمان باللہ، محبت اور خوفِ الٰہی، نیکی اور پرہیزگاری، شرافت اور امانت، حکومت اور سیاست الغرض زندگی کے ہر معاملے میں ایک کامل و اکمل نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ باری تعالیٰ نے حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو مسلمانوں کے لیے بطورِ مثال پیش کیا ہے اور اس امر کی تاکید کی ہے کہ زندگی کے جس معاملے میں انہیں رضائے الٰہی کے عملی تقاضوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہو اور یہ معلوم کرنا مقصود ہو کہ اللہ پر ایمان کس پاکیزہ زندگی کا طالب ہے تو انہیں حضور سرورِ کائنات کی مقدس زندگی کی طرف رجوع کرنا چاہیے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ (الاحزاب۔ ۲۱)

تحقیق تمہارے پاس اللہ کے رسول (کی زندگی) میں اُسوۂ حسنہ ہے، اس کے لیے جو ڈرتا ہو اللہ اور روزِ آخرت سے۔

حضور سرورِ کائنات کی زندگی صرف ایک پہلو ہی میں نمونہ نہیں بلکہ ہر لحاظ سے نمونہ ہے۔ انسان اور خدا کے ساتھ تعلقات ہیں، انسان اور انسان کے ساتھ تعلقات میں اور انسان اور کائنات کے ساتھ تعلقات میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہی حق اور صداقت کا واحد معیار ہے۔ اس ایک معیار کے سوا باری تعالیٰ کو کوئی دوسرا معیار قبول نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کو ہمارے لیے اس بنا پر بھی اُسوہ بنایا گیا ہے کہ اللہ کا نبی جو کچھ کہتا ہے یا جو کچھ کرتا ہے وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہی ہوتا ہے اُس کی زبان فیض ترجمان حق تعالیٰ کے ارشادات کی شارح ہوتی ہے اور اس کا عمل آیاتِ الٰہی کی، اُسی کے حکم کے مطابق عملی تفسیر ہوتا ہے۔

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔

اور وہ نہیں بولتا اپنی خواہش سے مگر وہی کچھ جو کہ وحی بھیجی جاتی ہے اس پر

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق صرف قرآن مجید ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اس آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تو اس حقیقت کا واضح پتہ چلتا ہے کہ وحی کے ذریعہ صرف قرآن مجید ہی نہیں اُتارا گیا بلکہ دوسرے احکام بھی حضور سرورِ دو عالم کو وحی کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں اور دوسرے معاملات میں بھی باری تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے رسول کی رہنمائی فرمائی ہے۔ فرشتے کے نزول کے بیان کے بعد قرآن مجید نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر جو کچھ دیکھا اور سنا وہ سراسر حق تھا اور اس کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ اُسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى سے اس بات کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس موقع پر حضور سرورِ کائنات کو وحی کے ذریعے بعض باتوں کا علم ہوا جن کی تفصیل قرآن مجید سے نہیں بلکہ احادیث نبوی ہی سے ملتی ہے۔ اس آیت سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کا کلام دین میں حجت ہے کیونکہ وہ کوئی بات بھی خواہش سے نہیں کہتا بلکہ وحی الٰہی کے تحت کہتا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ (النور۔ ۶۳)

تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے۔

اور ایک دوسرے مقام پر حکم دیا گیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ (الحجرات: ۲،۱)

اے ایمان والو تم اللہ اور اُس کے رسول سے کسی کام میں سبقت مت کیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ اُن سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر بولا کرتے ہو۔ کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں۔

مسلمانوں کو پہلی بات یہ ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل میں [illegible]

نہ کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ صحیح، مستند بات وہی ہے جو حضور کی طرف سے منقول ہو کیونکہ حضورؐ وحی الٰہی کے ترجمان ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے یہ دیکھو کہ اللہ کے رسول کسی معاملے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور اس کے بعد اُس کے مطابق عمل کرو۔ اپنی بات کو اُن کے مقابلے میں بالا کرنے کی کوشش نہ کرو۔

امام ابن قیم نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "اگر محض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی آواز سے اپنی آواز بالا کرنے سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں تو اُن لوگوں کے اعمال کا ضیاع یقینی ہے جو اپنی فکر، اپنے فہم و تدبّر اور اپنی آراء کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات اور اعمال پر فوقیت دیتے ہیں"۔[1] فوقیت صرف یہی نہیں کہ آدمی زبان سے یہ کہے کہ اُس کی رائے حضورؐ کی رائے سے بالاتر ہے بلکہ فوقیت یہ ہے کہ حضورؐ کے اقوال و افعال کو نظر انداز کر کے کوئی طرزِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بے نیازی کسی مومن کی شان نہیں بلکہ کافرانہ جسارت ہے۔

ظاہر بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات اقدس کے بارے میں یہ تنبیہات صرف قرآن مجید کے معاملے تک تو محدود نہیں کہ جب حضور سرورِ دو عالم قرآن مجید کے الفاظ زبان مبارک سے ادا کر رہے ہوں تو تم ان باتوں کا خاص خیال رکھو۔ یہ تنبیہات حضور کے ہر فعل اور ہر لفظ کے بارے میں ہیں۔ حضورؐ کی کسی امر کے بارے میں صراحت سے پہلے اپنی طرف سے کسی مومن کو پیش قدمی نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ منشائے خداوندی کو حضورؐ کی وساطت کے بغیر نہیں جانا جا سکتا۔ اسی طرح صوت النبی میں حضور سرورِ دو عالم کے حلق سے نکلی ہوئی ہر آواز شامل ہے خواہ وہ قرآن کے الفاظ ہوں یا حضور سرورِ کائنات کے اپنے ارشادات کیونکہ حضورؐ کی ہر بات اور اُن کا ہر عمل خداوند تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (الاعراف ۲۰۳)

آپ کہہ دیجیے کہ میں تو بس اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو کچھ میرے اوپر میرے پروردگار کی طرف سے وحی ہوا ہے اور یہ (خود بہت سی) دلیلیں ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔

[1] اعلام الموقعین، جلد اول ص ۵۱

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی پوری زندگی وحیِ الٰہی کے مطابق بسر ہوئی اور حضورؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا یا کیا وہ سب وحیِ الٰہی کے اشارے پر تھا۔ کیا کوئی صاحبِ عقل اس بات کو باور کرسکتا ہے کہ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ساری سرگرمیاں صرف قرآن مجید سنانے اور اس کے اندر مندرج احکام کی پیروی کرنے میں بسر کیں۔ خود کلام الٰہی میں بعض ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بعض احکام صرف حضور سرورِ کائنات نے دیئے جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں۔ میں یہاں صرف دو امور کا ذکر کرتا ہوں سورۂ توبہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا — اور ان میں سے جو کوئی مرجائے اُس پر کبھی بھی نماز جنازہ نہ پڑھیے۔ (توبہ ۸۴)

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول سے پہلے نماز جنازہ شروع ہوچکی تھی اور مسلم معاشرے سے تعلق رکھنے والے جو لوگ فوت ہوجاتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی نماز جنازہ پڑھایا کرتے تھے، حالانکہ قرآن میں نازل ہونے والی کوئی آیت ایسی نہیں بتلائی جاسکتی جس میں حضور اور مسلمانوں کو نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز جنازہ حضورؐ کے حکم سے شروع ہوئی۔

اسی طرح سورۃ جمعہ کی آیت وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا (۲) میں ایک حکایت اور شکایت کے ضمن میں جمعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز جمعہ حضور کے حکم کے مطابق اس آیت کے نزول سے پہلے ہی شروع ہوچکی تھی اور مسلمان اسے حضور کے حکم ہی سے ادا کر رہے تھے۔ یہاں نماز جمعہ کے آغاز کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ایک شرعی حکم اور دینی عمل جو حضورؐ کے فرمان سے شروع ہوچکا ہے اُس کے بارے میں بعض افراد کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی۔ قرآن مجید سے اس قسم کی ایک نہیں بلکہ متعدد مثالیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے اس بات کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کے احکام اور آپ کے اعمال ہی سے شریعت کا نظام تشکیل پا رہا تھا اور لوگ ان احکام و اعمال کو دین میں اُسی طرح حجت مانتے تھے جس طرح کہ احکام ربانی کو، بلکہ احکام ربانی کو صحیح طور پر سمجھنے اور انہیں ٹھیک انداز سے بجا لانے کے لیے وہ حضور سرورِ دوعالم کی طرف رجوع کرتے تاکہ وہ انہیں ان احکام کی صحیح نوعیت اور صورت بتائیں۔ مثلاً قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کا تاکیدی حکم نازل ہوا اور

اس کے ارکان اور بعض اجزائے ترکیبی مثلاً قیام، رکوع، سجود، قرأت وغیرہ کا ذکر بھی کتاب الہٰی میں موجود ہے مگر ان اجزاء کو کسی خاص ترتیب کے ساتھ ادا کرنے کا بیان اور نماز کی پوری ترکیب اس میں مذکور نہیں۔ صرف اقیموا الصلوٰۃ سے تو کوئی واضح چیز سامنے نہیں آتی۔ اگر اسے محض لغت کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اَلصَّلی کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں۔ چنانچہ صَلِیَ بالنّار کے معنی ہیں اُس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔ پھر اس کے معنی دعا دینے کے بھی ہیں۔ عربی کا محاورہ ہے صَلَّیْتُ عَلَیْہِ، امام رازی نے اس کے معنی کیے ہیں ای دعوتُ لہ، یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی۔ پھر قرآن میں فرشتوں کے متعلق مذکور ہے کہ وہ اللہ کے رسولؐ پر صلوٰۃ پڑھتے ہیں۔ صلوٰۃ کے ان مختلف لغوی معنوں کو اگر نگاہ میں رکھ کر اسلام کے اس سب سے اہم فرض کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کوئی بات بھی واضح نہیں ہوتی۔ احادیث نبوی کو اگر درمیان سے نکال دیا جائے تو ایک شخص بجا طور پر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اگر وہ آگ تاپ لے تو اس فریضہ سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص محض زبان سے چند دعائیہ کلمات ادا کر کے اقامتِ صلوٰۃ کے فرض سے سبکدوش ہونے کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ نماز کی جو صورت اس وقت موجود ہے اور جس پر تواتر کے ساتھ ساڑھے تیرہ سو سال سے کروڑوں مسلمان عمل پیرا ہیں وہ حضورؐ کی وساطت ہی سے ہم تک پہنچی ہے۔ حضور سرورِ دو عالمؐ نے اقامت الصلوٰۃ کے فرض کی خود نماز قائم کر کے صراحت فرمائی اور حکم دیا: صَلُّوا کَمَا رَأَیْتُمُونِی اُصَلِّی یعنی تم جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو، اسی طرح نماز پڑھو۔ اور امت نے حضور سرورِ دو عالمؐ کے عمل ہی سے نماز کی صحیح ترتیب اور اس کے اجزاء کی ترکیب معلوم کی۔ اگر حضورؐ اس معاملے میں ہماری رہنمائی نہ فرماتے تو ہمارے سامنے صلوٰۃ کی کوئی واضح اور متعین صورت سامنے نہ آتی اور ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق لفظ صلوٰۃ کی تشریح کر کے عمل کرتا چلا جاتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے احادیث نبوی سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن سے نماز کی ترتیب اور اس کا طریقہ جاننے کی کوشش کی ہے وہ آج تک نماز کی کوئی ایسی ہیئت سامنے نہیں لا سکے جس پر سب کا اتفاق ہو۔ یہی حال حج، زکوٰۃ، صوم اور جہاد کا ہے۔ حج کے لغوی معنی کسی کے دیکھنے کا قصد کرنے کے ہیں۔ خود قرآن مجید میں حج کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی ہے اُس میں صرف حج البیت کا ذکر ہے جس سے اگر زیادہ سے زیادہ سمجھا جا سکتا ہے تو یہی کہ بیت اللہ کے قصد کا حکم دیا جا رہا ہے۔ لیکن اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے خاص ایام میں عرفہ میں جانا، خاص مدت تک

قیام کرنا اور دوسرے مناسک، یہ سب باتیں ہمیں احادیث نبوی ہی سے ملتی ہیں حضورؐ نے یہ ساری باتیں اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت سے تو نہیں فرمائیں بلکہ اُن سب کی وضاحت اُن کے فریضۂ نبوت میں شامل تھی۔ چنانچہ قرآن پاک نبیؐ کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل-۴۴)	اور نازل کیا ہم نے آپ کے ہاں ذکر (کتاب) تاکہ آپ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اُس چیز کو جو نازل کی گئی اُن کی طرف اور تاکہ وہ غور و فکر کریں

یہ آیت اس امر کی توضیح کرتی ہے کہ رسول کا کام معاذ اللہ محض ہرکارے کا نہیں کہ وہ صرف کتاب الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دے بلکہ اس عظیم کتاب کی تشریح بھی اُس کے فریضۂ نبوت میں داخل ہے اور رسول یہ کام باری تعالیٰ کے حکم کے مطابق اُسی کی رہنمائی میں سرانجام دیتا ہے۔ اس "تبیّن" کی کئی صورتیں ہیں۔

(ا) باری تعالیٰ نے قرآن مجید میں جن امور کو مجمل بیان کیا ہے رسُول ان کی صراحت فرمائیں۔

(ب) اپنے عمل سے اُن کی وضاحت کریں۔

(ج) جن امور میں اختلاف ہو اُن کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرما کر انہیں حتمی طور پر طے کر دیں۔

(د) صحیح اور غلط راستوں کی پوری طرح نشاندہی کر دیں تاکہ سلامتی کے راستے پر چلنے والے اپنے آپ کو گمراہی سے بالکل محفوظ رکھ سکیں۔

قرآن مجید میں لفظ تبیّن کے یہ سارے مفہوم ملتے ہیں۔ مثلاً مخفی اور مضمر چیز کی وضاحت کے لیے قرآن مجید کی یہ آیات بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہیں :

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ (ابراہیم ۴۵)	اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا تھا۔
وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ۔ (الزخرف-۶۳)	نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو اُن کی وضاحت کر دوں۔
قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ-۲۵۶)	ہدایت صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے الگ ہو جائیگی

یہ چند آیات محض مثال کے طور پر درج کی گئی ہیں۔ قرآن مجید کی بے شمار آیات "تبیّن" کے ان مختلف پہلوؤں کی طرف نہایت واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں۔

قرآن مجید کے مجمل احکام کی حضورؐ نے وضاحت فرمائی اور آںؐ کے ارشادات سے ہی ہمیں ان کے صحیح مفہوم کا علم ہوگا۔ مثلاً سورۃ الانعام میں خداوند تعالیٰ نے مختلف اثمار کے باغات کا ذکر کرتے ہوئے صرف اتنا ہی ارشاد فرمایا :-

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۔ (آیت ۱۴۲)

اور فصل کاٹنے کے دن اُن کا حق ادا کرو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فصل کاٹنے کے دن ان کا حق ادا کرنے کے حکم سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ باری تعالیٰ کا منشا کیا ہے اس ضمن میں اگر احکامِ رسول سامنے نہ ہوں تو ایک نہیں بلکہ کئی مطالب نکالے جا سکتے ہیں۔ مثلاً جن لوگوں نے ان پھلوں کی کاشت میں محنت مزدوری کی ہے، انہیں اجرت دو، یا ان میں سے زمین کے مالکان کو اُن کا حصہ دو۔ یا انہیں خوب سنبھال کر رکھو اور انہیں ضائع نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس موقع پر سنت ہی سے ہمیں یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ یہاں پیداوار زمین سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ پھر اس کی شرح بھی ہمیں احادیثِ نبوی ہی سے معلوم ہوتی ہے اور یہاں لفظ مُسرفین کے محل استعمال کا بھی صحیح پتہ کتب احادیث سے چلتا ہے۔

اسی "تبیّن" کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر اس بات کی بھی ذمہ داری عائد فرمائی ہے کہ وہ عمومی احکام کی صحیح نوعیت متعین کر کے ان کی مستثنیات بیان کر دیں۔ مثلاً قرآن مجید میں چور کی سزا یہ ہے :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۔ (المائدہ۔ ۳۸)

اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ اُن کے کرتوتوں کے عوض اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور عبرتناک سزا کے۔

السارق اور السارقہ کے جرم کا فیصلہ کرتے میں ہمیں کئی ایک دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مثلاً اسلامی شریعت کی رُو سے چوری کی تعریف کیا ہے اور کیا ہر چور کے ہاتھ کاٹ دینے چاہئیں خواہ اس کے جُرم کی نوعیت کتنی ہی معمولی

کیوں نہ ہو کیا جو شخص ذہنی طور پر مفلوج ہے اُس سے بھی اگر اس جرم کا ارتکاب ہو جائے تو وہ بھی قطع ید کی سزا کا مستوجب ہے ؟ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ کیا ایک شخص فی الواقع چور ہے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات چوری کے سلسلے میں ذہن میں آتے ہیں جن کا قرآن مجید کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس اجمال کی تفصیل ہمیں صرف سنتِ نبوی سے ملتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے کہ سرقہ کا اطلاق خیانت پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اس فعل پر ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو اس کی حفاظت سے نکال کر اپنے قبضے میں کرے۔ چنانچہ جو مال حفاظت میں نہیں اس کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا بھی نہیں دی جا سکتی۔ پھل، ترکاری، کھانے پینے کی چیزوں اور حقیر اشیاء کی چوری بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ یہ سب تفصیلات ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوتی ہیں اور سنت ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ حضورؐ نے ان امور کا فیصلہ اپنی ذاتی رائے سے فرمایا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ باری تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس باطل خیال کی واضح طور پر تردید کی ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔ (النساء۔ ۱۰۵)

اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ اسی کے مطابق کریں جو اللہ نے آپ کو سمجھا دیا ہے۔

یعنی اس کتاب کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام نے جو فیصلے فرمائے ہیں اُن کی نوعیت عام اجتہاد کی نہیں بلکہ احکامِ خداوندی کی ہے۔ کیونکہ ان سب میں قادرِ مطلق نے حضور سرورِ کائنات کی براہِ راست رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ یہ سارے فیصلے بھی درحقیقت اسی ذاتِ برحق ہی کے ہیں جس نے قرآن نازل فرمایا ہے۔ ان فیصلوں سے انحراف ایک ایسا باغیانہ طرزِ عمل ہے جس سے ایمان اکارت ہو جاتا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء۔ ۶۵)

اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اس آیت سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینا ایمان کی بنیادی شرط ہے کیونکہ یہ محض کسی دانشور یا قاضی کے فیصلے نہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہو، یا ان کے خلاف اپیل کے دروازے کھلے ہوئے ہوں بلکہ ترجمانِ وحی کے فیصلے ہونے کی بنا پر یہ اسی طرح واجب الاطاعت ہیں جس طرح کہ خود باری تعالیٰ کے فیصلے۔ ان کے درمیان اگر فرق ہے تو یہی کہ کچھ فیصلے اُس نے خود اپنی زبان سے فرمائے ہیں اور بعض اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے صادر کروائے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ (الاحزاب۔ ۳۶)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا فیصلہ صادر کر دیں تو انہیں کوئی اختیار باقی رہے۔

یہاں اللہ اور رسول دونوں کے فیصلوں کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے اور اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ ایک مومن کا کام ان دونوں کے فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا ہے۔ قرآن مجید نے اپنے معجزانہ اندازِ بیان سے اُس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے جو بعض ذہنوں میں پیدا ہو سکتی ہے کہ رسول کے فیصلوں سے مراد صرف اُن نزاعی امور کے فیصلے ہیں جو دو فریق حضورؐ کے پاس تصفیہ کے لیے لاتے تھے۔ مندرجۂ بالا آیت میں امر کو بطور نکرہ استعمال کر کے قرآن مجید نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ حضورؐ کو صرف جھگڑے چکانے کے لیے ہی حکم مقرر نہیں کیا گیا بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں حضور سرورِ دو عالمؐ کا ارشاد دین میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے اور اس سے پہلو تہی ایمان کو غارت کر دیتی ہے۔ حضورؐ کے یہ فیصلے صرف ایک شعبۂ زندگی یا متنازع فیہ معاملات تک ہی محدود نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہیں اور ان سب کو دل و جان سے تسلیم کرنے ہی سے ایمان کا بنیادی تقاضا پورا ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کی تعلیم و تفہیم، اُس کے مضمرات کی وضاحت اور پھر کلامِ الٰہی کے مطابق لوگوں کا تزکیۂ نفس "تبیّن" ہی کے مختلف گوشے ہیں جس قادرِ مطلق نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے قرآن نازل فرمایا اس نے اس بات کا بھی خاص طور پر اہتمام کیا کہ لوگ اس کی تلاوت کے صحیح انداز، اس کی گہری حکمتوں اور اس کی حیات آفریں تعلیمات کو بھی اُسی رسول کی زبان سے سُنیں اور سمجھیں جس کی وساطت سے نوعِ بشری کو اللہ تعالیٰ کا یہ بیش قیمت عطیہ ملا ہے۔ قادرِ مطلق اور لامحدود ذات کے کلام کو محدود فکر و نظر رکھنے والا انسان آخر اپنی معمولی سی عقل کے ساتھ کیونکر اچھی طرح سمجھ سکتا ہے

اس لیے باری تعالیٰ نے نوعِ انسانی پر رحم کرتے ہوئے اس بات کا التزام کیا کہ انسانوں میں اپنی حکمتِ بالغہ کے مطابق بعض مقدس ہستیوں کا انتخاب کیا جائے اور انہیں نبوت سے سرفراز فرما کر کلامِ الٰہی کی تعلیم کی ذمہ داری سونپی جائے۔ اگر محض عقلِ انسانی خود اپنے برتنے پر کلامِ ربانی کو سمجھنے پر قادر ہوتی تو پھر رسول کی ضرورت قطعاً پیش نہ آتی۔ کیا اُس بزرگ و برتر ذات کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے کلام کے کروڑوں نسخے فرشتوں کی مدد سے نوعِ انسانی میں تقسیم کر دیتی یا پھر فضا کو اس بات پر مامور کر دیتی کہ وہ ہر وقت اس کے پیغام کو نشر کرتی رہے۔ اپنے پیغام پہنچانے کے لیے بعض انسانوں کا انتخاب صرف اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ انسان کے ذریعہ ہی انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جن مقدس ہستیوں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی وہ پوری انسانیت میں اگرچہ فہم و احساس کے اعتبار سے بھی افضل ہیں مگر اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی براہِ راست نگرانی فرماتا ہے اور رسالت کے کام میں ہر قدم پر اُن کی رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ جس قادرِ مطلق نے انہیں اپنا کلام انسانوں تک پہنچانے کے لیے دیا ہے اُسی ذاتِ برحق نے انہیں اس کلام کا صحیح فہم بھی عطا فرمایا ہے اور اس کے مختلف گوشوں کو اس کے سامنے بے نقاب کیا ہے۔ ایک نبی اور غیر نبی کے شعور و ادراک میں یہی بنیادی فرق ہے پیغمبر جو کچھ حاصل کرتا ہے خدا سے حاصل کرتا ہے یا اس کے مشاہدات اور تجربات کی باری تعالیٰ کے دربار سے واضح طور پر تائید یا تصحیح ہو جاتی ہے اور پھر پیغمبر کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے کام کو پسند فرمایا ہے۔ پیغمبر کے علاوہ دوسرے جتنے انسان ہیں انہیں اپنے طرزِ عمل کے بارے میں کوئی ایسا یقینی علم حاصل نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر وہ پورے وثوق سے یہ کہہ سکیں کہ اُسے اللہ کے ہاں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے طرزِ عمل کی کس طرح خود نگرانی فرماتے ہیں اور کس طرح ہر قدم پر انہیں زندگی کے ہر معاملے میں ہدایت دیتے ہیں اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک نابینا صحابی آئے اور آپؐ نے مصالح کے تحت سردارانِ قریش سے اپنے آپ کو مصروف رکھا اور اُن کی طرف توجہ نہ دی تو باری تعالیٰ نے فوراً حضورؐ کے طرزِ عمل پر گرفت کی اور انہیں بتایا کہ ان کا رویہ خدا کو کھٹکا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۔ (عبس)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس پر کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تجھ کو کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا اور پاک ہوتا۔

اسی سلسلے میں مسجد ضرار کا واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضور اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے کہ مندرجہ ذیل آیت کا نزول ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام سے منع کر دیا گیا۔

لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ

تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی ہے وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔

اسی نوعیت کے کئی ایک واقعات قرآن مجید میں موجود ہیں جو اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ نبی جو کام بھی کرتا ہے خدا کی ہدایت اور اُس کی واضح نگرانی میں کرتا ہے۔ کیا کسی غیر نبی کے طرزِ عمل کی بھی اس نہج پر نگرانی ہوئی ہے؟ اگر باری تعالیٰ ان چھوٹے چھوٹے امور میں اپنے پیغمبر کو ہدایت کرتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رسالت کی نازک ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کا کام اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے محض فہم و تدبر پر چھوڑ دیا ہو اور اُسے اس امر کا اختیار دیا ہو کہ وہ تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی عقل سے فیصلے کرتا رہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کو عقل و فہم سے معاذ اللہ محروم رکھا جاتا ہے بلکہ میری اس گزارش کا مطلب صرف یہ ہے کہ نبی کی عقل کی باری تعالیٰ خود حفاظت کرتا ہے اور اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ وہ جو فیصلے بھی کرے وہ خدا کی منشا کے عین مطابق ہوں اور نبی کو اس بات کا واضح طور پر شعور ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے فیصلوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کہا گیا ہے اور نبی کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت سے تعبیر کیا گیا ہے[1]۔

اگر اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات خود بخود نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض بھی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیے ہیں اور آپؐ نے انہیں جس طرح سے سرانجام دیا ہے ان سب میں خدا کی رضا اور اس کی نگہداشت اور اس کی رہنمائی اول سے آخر تک اس انداز میں شامل رہی ہے کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے سارے اقوال اور حضور کی حیاتِ طیبہ کے سارے اعمال درحقیقت کلام الٰہی کی الہامی تفسیریں ہیں۔ اس بنا پر کسی فرد یا گروہ یا ادارے کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان کے

---

[1] إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ۔ (الفتح - ۱۰)

اندر کوئی تغیر و تبدل کرے۔ حضورؐ نے اپنے فرض کی ادائیگی میں جو کچھ کیا وہ سب خدا کی طرف سے کیا اور اس بنا پر حضور کے احکام کی پابندی ایک مسلمان کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ احکامِ الٰہی کی پابندی۔ ہم تک تو کلامِ الٰہی اُسی مقدس ذات کے ذریعے سے پہنچا ہے اور اُسی کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس کی تشریح و توضیح کے لیے جو ارشاد فرمائے وہی خدا کی نظر میں سب سے زیادہ مستند اور صحیح ہے کیونکہ اس کی وضاحت کا کام بھی خداوند قدوس نے اس مقدس ہستی کے سپرد کیا ہے۔ اور یہ باری تعالیٰ کا انسانیت پر عظیم احسان ہے کہ اپنے کلام کی تشریح بھی اُس نے خود ہی اپنے نبی کے ذریعہ فرما دی۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (آل عمران - ۱۷)

یقیناً احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جبکہ بھیجا اُن میں ایک رسول انہی میں سے کہ تلاوت کرتا ہے اُن پر اُس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے اُن کو اور تعلیم دیتا ہے اُن کو کتاب و حکمت کی اور وہ اس سے پہلے واضح طور پر گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت سے بڑے واضح الفاظ میں اُن مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے جن کے لیے حضور سرورِ کائنات کو مبعوث فرمایا گیا۔ پہلی چیز یعنی تلاوتِ آیات کا مطلب تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی صورت میں جو کتاب اُن پر نازل فرمائی اس کی تلاوت کرنا۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام محض کتاب الٰہی کے مربوط و مرتب کلمات کو پڑھ کر سنانا ہی ہے تو پھر تعلیم کتاب کا ذکر کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی اس حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں تعلیمِ کتاب کا مطلب آیات کی تشریح اس کے معانی و مطالب کی وضاحت اور کتاب اللہ کے احکام کی صراحت ہے اور یہ سب کام فرائضِ رسالت میں اُسی طرح داخل ہیں جس طرح کہ قرآن مجید کے کلمات کی تلاوت و تبلیغ۔ اب اگر متنِ قرآن دین میں حجت ہے تو وہ وضاحت اور صراحت بھی دین میں حجت ماننا پڑتی ہے جو تعلیم کتاب کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے رسول نے ارشاد فرمائی ہے کیونکہ حضور کو یہ فرض بھی تلاوتِ آیات کی طرح بطورِ رسول سونپا گیا ہے۔ یہ کام حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی یا شخصی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ

باری تعالیٰ کے حکم کے مطابق رسالت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے کیا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے قرآن کے جن الفاظ کو تلاوت فرمایا ہے وہ تو دین میں حجت ہوں مگر انھوں نے الفاظ کے جو معانی بیان فرمائے ہیں یا جو مطالب متعین کیے ہیں یا احکامِ الٰہی کی جن حکمتوں کا ذکر کیا ہے ان کی حیثیت محض تاریخی ریکارڈ کی ہو۔ قرآن مجید اس بات کی پُرزور تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس طرح تلاوت کے معاملے میں اتباع لازمی ہے بالکل اسی طرح تعلیم کتاب کے سلسلے میں بھی اُن کے ارشادات کی اطاعت اور فرمانبرداری بھی انتہائی ضروری ہے۔

وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ (حشر۔ ۱)	جو تم کو رسول دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ۔

قرآن مجید میں جابجا اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کو مستقل جملوں کی صورت میں ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے اس سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کی طرح اہلِ ایمان پر رسول کی اطاعت بھی مستقلاً فرض ہے کیونکہ اُن کے ذریعہ ہمیں دین کے معاملے میں جو کچھ ملا ہے وہی خدا کے نزدیک صحیح اور مستند ہے۔

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (النور۔ ۵۱)	مومنوں کا قول تو یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ اور اُس کے رسول کی طرف انہیں بلایا جائے تاکہ رسول اُن کے درمیان حکم کرے تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ پس یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں بھی دو مستقل تابعداریوں کا ذکر آیا ہے اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ حکم کا صیغہ واحد ہے جس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی پابندی ہم پر فرض ہے مگر دنیا میں ان احکام کی توضیح اور ان کی تعیین کے لیے ہمیں حضور سرورِ کائنات کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اور وہاں سے جو فیصلہ صادر ہوگا وہی ان احکام کا صحیح منشا قرار دیا جائے گا۔ پھر یہاں فعل مضارع استعمال کیا گیا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل مُطاع ہونے پر صاف طور پر دلالت کرتا ہے۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت حضور سرورِ دوعالم کی اس حیثیت کی پوری طرح تائید کرتی ہے:

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ۔

فرماں برداری کرو اللہ کی اور فرماں برداری کرو رسول کی اور اُن کی جو تم پر حکم کے مالک ہیں۔ پھر اگر تم میں کسی معاملے میں نزاع پیدا ہو جائے تو اُسے خدا اور رسول کے سامنے پیش کر دو۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین اطاعتیں واجب فرمائی ہیں اور اُن کے درمیان جو بنیادی فرق ہے اُسے بھی بیان کر دیا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تو مستقل طور پر واجب ہے اور اولوالامر کی اطاعت کو ان دو اطاعتوں کے تابع رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اولوالامر کی اطاعت کے ساتھ فعل حذف کیا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ رسول کی اطاعت اُن کی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ قیامت تک یہ ہم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح کہ خدا کی اطاعت۔ اولوالامر کی اطاعت ان دونوں اطاعتوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے یہ مستقل نہیں بلکہ عارضی ہے اور یہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔ ہمارے اسلاف اس فرق سے کتنی اچھی طرح واقف تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضورؐ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کبھی بھی آپؐ کے کسی حکم کے بارے میں قرآن سے دلیل پیش کرنے کا مطالبہ نہیں کیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا وہ اپنے حکمرانوں اور ائمہ سے ہر کام میں قرآن و احادیث سے دلائل پیش کرنے کا مطالبہ کرتے رہے۔

رسائل و مسائل

خلافت و ملوکیت

سوال: مولانا مودودی نے اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" ص۱۸۱ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے وہ تمام جائدادیں واپس کر دیں جو ان کو ناجائز طریقے سے وراثت میں ملی تھیں اور یہ کہا تھا کہ جب فرمانروا کے اپنے عزیز و قریب ظلم کریں اور فرمانروا اس کا ازالہ نہ کرے تو وہ دوسروں کو کیا منہ لے کر ظلم سے روک سکتا ہے؟ ان واقعات کے ثبوت میں مولانا نے البدایہ اور ابن اثیر کی تاریخوں کا حوالہ دیا ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان تاریخی کتابوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ بنو عباس اور بعض دوسرے عناصر نے مروان اور بنو مروان کو بدنام کرنے کے لیے ایسے قصے کہانیاں تصنیف کر لیے تھے اور یہی مواد تاریخی کتابوں میں راہ پا گیا، ورنہ درحقیقت بنو امیہ کا دور ایک مثالی دور تھا۔

مولانا نے اسی کتاب کے ص۱۷۴ پر یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے حکم سے ان کے گورنر خطبوں میں حضرت علیؓ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ اس کے لیے بھی طبری، ابن اثیر اور البدایہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہاں پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تاریخی کتابوں کے بل پر حضرت معاویہؓ کے خلاف ایسا الزام عائد کرنا کہاں تک درست ہے۔ حضرت معاویہؓ کے جانشینوں کے متعلق اگر ایسی بات کہی جائے، تو معاملہ اتنا سخت نہیں، لیکن حضرت معاویہؓ کے بارے میں ایسا تصور محال ہے کہ وہ خود ایسا کرتے یا دوسروں کو ایسا کرنے پر آمادہ کرتے ہوں گے۔"

جواب - (از غلام علی) آپ کے سوالات کے جواب میں پہلی گزارش یہ ہے کہ تاریخی بحثوں اور تاریخی

واقعات میں کتبِ تاریخ پر انحصار ایک ناگزیر امر ہے۔ جو واقعات نزولِ قرآن اور عہدِ نبوی کے بعد رونما ہوئے ہیں، ان کے بارے میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کا تفصیلی بیان قرآن یا حدیث میں ہوگا۔ ان کے متعلق پیشین گوئیوں کی شکل میں بعض اشارات تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں، مگر ان کی تفصیلات بہر حال ہمیں تاریخ ہی میں مل سکتی ہیں اور انہیں معلوم کرنے کے لیے لامحالہ ہمیں تاریخ کی کتابوں ہی کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔ یہ ایک فطری ضرورت ہے اور اسی کے پیشِ نظر ہمارے مؤرخین نے تاریخی کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان مؤرخین میں سے بیشتر مفسرین و محدثین بھی ہیں۔ اور ان کے متعلق یہ باور کر لینا محال ہے کہ انہوں نے بے سروپا اور جھوٹے قصے کہانیاں جمع کر دی ہوں گی اور پھر پوری امت کے اہلِ علم انہیں آنکھیں بند کر کے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرتے چلے آئے ہوں گے۔

آپ نے جن تاریخی واقعات کا سوال میں ذکر کیا ہے، اگرچہ مولانا مودودی نے انہیں تاریخی مآخذ سے نقل کیا ہے، لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ حدیث کی کتابیں ان سے بالکل خالی ہیں۔ آپ نے جن واقعات پر تعجب کا اظہار کیا ہے وہ حدیث کی کتابوں حتیٰ کہ صحاح ستہ میں بھی مروی ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سننِ ابی داؤد، کتاب الخراج کی ایک روایت ملاحظہ ہو:

حدثنا عبد الله بن الجراح حدثنا جرير عن المغيرة قال جمع عمر بن عبد العزيز بني مروان حين استخلف فقال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كانت له فدك فكان ينفق منها على صغير بني هاشم ويزوج منها ايمهم وان فاطمة سألته ان يجعلها لها فابى فكانت كذالك في حيوة رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى مضى لسبيله فلما ان ولي ابو بكر عمل فيها بما عمل النبي صلى الله عليه وسلم في حيوته حتى مضى

ہم سے عبداللہ ابن الجراح نے بیان کیا۔ ان سے جریر نے مغیرہ کے حوالے سے بیان کیا کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بنو مروان کو جمع کیا۔ پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک کے باغات تھے آپ اس میں سے بنو ہاشم کے نابالغ افراد پر خرچ کرتے تھے اور بیوہ یا غیر شادی شدہ کا نکاح کرتے تھے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ سے مطالبہ کیا کہ یہ جائداد انہیں دے دی جائے مگر آنحضورؐ نے انکار فرما دیا۔ حیاتِ نبوی میں یہی صورت رہی حتیٰ کہ آپؐ کا وصال ہو گیا۔ پھر جب ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے

لسبیلہ فلما ولی عمر عمل فیھا بمثل ما عملا حتیٰ مضیٰ لسبیلہ ثم اقطعھا مروان ثم صارت لعمر بن عبدالعزیز قال عمر یعنی ابن عبد العزیز فرأیت امراً منعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاطمۃ لیس لی بحق وانی اشھدکم انی قد رددتھا علی ما کانت یعنی علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

تو آپ نے بھی عمل نبوی کے مطابق عمل کیا تھی کہ آپ بھی وفات پاگئے۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو آپ نے بھی دونوں پیشرووں کی کارروائی کے موافق عمل کیا یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہوگیا۔ پھر مروان نے فدک کو اپنی جاگیر بنا لیا اور یہ عمر بن عبدالعزیز کو ورثے میں ملی انہوں نے فرمایا: میری یہ رائے ہے کہ جس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو منع فرما دیا، وہ میرے لیے جائز نہیں اور میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں اس جائداد کی وہی حیثیت بحال کرتا ہوں جو عہد نبوی میں تھی۔

خط کشیدہ الفاظ کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے وہ سیاق و سباق کے بالکل مطابق ہے اور شارحین نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ . . . .

. . . چنانچہ صاحب بذل المجہود اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ثم اقطعھا ای جعلھا قطیعۃ لنفسہ (یعنی مروان نے اسے اپنی ذاتی جاگیر بنا لیا جو ان کے پوتے عبدالعزیز کو ان سے ملی)۔ اہل سنت کے ہاں یہ بات بالکل مسلّم ہے کہ یہ جائداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی جائداد یا ملکیت نہیں تھی بلکہ بحیثیت امیر قوم ان کے منصب اور عہدے کا مالی معاوضہ اس سے فراہم ہوتا تھا۔ لہٰذا آنحضور کے وصال کے بعد آپ کا جو بھی جانشین ہوگا، وہ اس سے مستفید ہوگا۔ ابوداؤد کے اسی باب کی دیگر احادیث اور صحاح کی متعدد دوسری احادیث سے یہ امر قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جو جائداد خالصہ قرار دی گئی تھی اور خمس وغنائم کا جو مال آنحضورؐ کے پاس آتا تھا، وہ آپ کے ورثہ کے طور پر ورثاء میں قابل تقسیم نہ تھا یہ گویا اسلامی سٹیٹ اور حکومتِ وقت کی تحویل میں رہے گا۔ اس سے ازواج مطہرات کا نفقہ ادا کیا جائے گا اور جو شخص بھی امت کا متولیٔ امر ہوگا، اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کفالت بھی اس سے ہوگی۔ مگر

مروان نے ان احکامِ صریحہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فدک کو ذاتی جاگیر بنا لیا، حالانکہ خود حضرت علیؓ کی روش اس معاملے میں یہ تھی کہ عہد صدیقی و فاروقی میں اگرچہ حضرت فاطمہؓ کا وکیل یا وارث ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس جائداد میں استحقاق کا مطالبہ کیا تھا لیکن جب خود امیر ہوئے تو اس جائداد کی وہی پوزیشن برقرار رکھی جو پہلے طے ہو چکی تھی۔

اس کے بعد اب دوسرے معاملے، یعنی امیر معاویہؓ کے حضرت علیؓ پر سب و شتم کرانے کو لیجیے۔ تاریخی کتابوں میں تو اس بری رسم کا ذکر تفصیل سے موجود ہی ہے کہ امیر معاویہؓ نے اسے جاری کیا اور آخر کار حضرت عمر بن العزیز ہی نے اسے ختم کرایا لیکن کتب صحاح بھی اس بارے میں خاموش نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ میں یہ روایت درج ہے۔

حدثنا قتیبة حدثنا حاتم بن اسماعیل عن ابن مثار عن عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابیه قال امر معاویة ابن ابی سفیان سعداً فقال ما یمنعك ان تسب ابا تراب - قال اما ما ذکرت ثلاثا قالهن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فلن اسبه - لان تکون لی واحدة منهن احب الی من حمر النعم ۔۔۔۔

ہم سے قتیبہ نے ۔۔۔ اور سعدؓ ابن ابی وقاص نے بیان کیا ہے کہ انہیں معاویہؓ ابن ابی سفیان نے امیر بنایا پھر کہا کہ تمہیں ابو تراب پر سب و شتم کرنے سے کیا چیز روکتی ہے۔ حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ جب میں تین ارشادات نبوی کو یاد کرتا ہوں تو میرے لیے ہرگز ممکن نہیں رہتا کہ میں سب علی کروں۔ یہ حضرت علیؓ کے تین مناقب ہیں جن میں سے اگر ایک بھی میرے حق میں ہوتا تو مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتا۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے وہ تین ارشادات بیان کیے جن میں سے ایک میں حضرت علیؓ سے کہا گیا تھا کہ اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسٰی الا انه لا نبوة بعدی۔ (کیا تجھے پسند نہیں کہ تو میرے لیے ایسا ہو جیسا کہ ہارونؑ موسیٰؑ کے لیے تھے اور یہ کہ میرے بعد کوئی نبوت نہیں) دوسرے ارشاد میں فرمایا: یحب اللہ ورسوله ویحبه اللہ ورسوله۔ (علی اللہ اور اس کے رسول سے

محبت رکھتے ہیں اور اللہ اور اس کا رسول علیؓ سے محبت رکھتے ہیں۔ تیسرے ارشاد میں حضرت علیؓ، فاطمہؓ اور حسینؓ کے بارے میں آنحضورؐ نے فرمایا: اللھم ھٰؤلاء اھلی (اے میرے اللہ یہ میرے اہل ہیں)۔

اس روایت کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ پر سب و شتم کرنے کرانے کا ایک عام قاعدہ بنا رکھا تھا، یہاں تک کہ جب حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص نے اس کی پابندی سے انکار کیا تو امیر معاویہؓ کو یہ بات انوکھی محسوس ہوئی اور اس پر باز پرس ضروری خیال کی۔ اس کے جواب میں حضرت سعدؓ کو حضرت علیؓ کے وہ مناقب بیان کرنے پڑے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے تھے اور جن کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو بُرا بھلا اور سخت دُرشت کہنا کسی طرح جائز نہ تھا۔
